سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دارالمصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد ۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے قلم سے اس سمینار کی بہت مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔ قیمت ۲۰ روپے۔

جلد ۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سمینار میں پڑھے گئے تھے جو معارف ۱۹۸۲ء سے لے کر ۱۹۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے۔

جلد ۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے۔

جلد ۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپے۔

جلد ۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپے۔

"منیجر"

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۴۶ ویں جلد

ماہ جولائی سنہ ۱۹۹۰ء تا ماہ دسمبر سنہ ۱۹۹۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۴۶

ماہ جولائی ۱۹۹۰ء تا ماہ دسمبر ۱۹۹۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۴۶ ماہ ذی الحجہ ۱۴۱۰ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۹۰ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

کشمیر میں تشدد، خوں ریزی اور قتل عام کا جو سلسلہ مہینوں سے جاری ہے وہ پوری دنیا میں ہندوستان کی رسوائی اور جگ ہنسائی کا سامان اور اس کے سیکولر اور جمہوری کردار پر ایک بدنما داغ ہے، ہر روز ہی بے گناہ اور بے قصور شہریوں کے مارے جانے کی اطلاعات آرہی ہیں، سب سے زیادہ دکھ اور اذیت کی بات یہ ہے کہ علمی، تعلیمی، مذہبی، سماجی اور سیاسی حیثیت سے بہت سے ممتاز اور سرکردہ افراد بھی کشتگان معرکہ کشمیر کی فہرست میں شامل ہیں، میر واعظ کشمیر مولوی محمد فاروق کا بہیمانہ اور دردناک قتل بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، وہ ۲۱ مئی کو دن دہاڑے بہت بے رحمی سے شہید کر دیے گئے، اور جب ان کا جنازہ اٹھا تو اس کے جلوس پر بھی گولیوں کی بوچھار کی گئی جس سے بے شمار اشخاص جاں بحق ہو گئے، اس کے بعد میر واعظ کے قاتل کے بارے میں کس کو کوئی شک و شبہہ ہو سکتا ہے، ان کا کوئی جرم نہ تھا، ان کی بے گناہی ہی ان کا جرم بن گئی ؎

بلوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے ❊ کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

وہ میر واعظان کشمیر کے اس خانوادے سے تعلق رکھتے تھے جس نے کشمیر میں دین و مذہب کی تبلیغ واشاعت اور مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح و تصحیح میں نمایاں حصہ لیا ہے، مولوی محمد فاروق تیرہ برس کی کم عمری ہی میں میر واعظ کے منصب پر فائز ہو گئے تھے، وہ انجمن نصرۃ الاسلام اور انجمن اوقاف جامع مسجد سری نگر کے سربراہ بھی تھے، بڑے وجیہ و شکیل اور نہایت پر کشش اور باوقار شخص تھے، موروثی و خاندانی وجاہت اور گوناگوں فطری صلاحیتوں کی بنا پر وہ کشمیر کے ایک برگزیدہ علمی، دینی اور سیاسی رہنما خیال کیے جاتے تھے جن کے معتقدین کا حلقہ بڑا وسیع تھا، مگر انھوں نے اپنی خدمات علمی و عملی جد و جہد اور مذہبی، ملی اور قومی سرگرمیوں کا دائرہ کشمیر ہی تک محدود نہیں رکھا تھا بلکہ وہ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے بھی اہم رکن تھے، اور ہندوستان کے مسلمانوں کی ملی و اجتماعی جد و جہد میں مختلف دینی و ملی رہنماؤں کے دوش بدوش حصہ لیتے تھے، کشمیر کی برف پوش وادی سے نکل کر وہ پورے

ملک میں اپنے وعظ و خطابت کا جوہر دکھاتے تھے، اور کئی بار اپنی حق گوئی و بیباکی کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں، ان کی موت ایک بڑا قومی و ملی حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ اس کی تلافی کرے اور مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین !!

فرقہ وارانہ فسادات ہندوستان کی گھٹی میں داخل ہو گئے ہیں، شرپسندوں اور فرقہ پرستوں سے قطع نظر خود سیاستداں بھی ان کو ہوا دیتے ہیں، کانگریس کے دور حکومت میں جو خوں چکاں فسادات ہوئے اور ان میں مسلمانوں پر جس قدر شدید مظالم ڈھائے گئے وہ حد و شمار سے باہر ہیں، جنتا دل کی حکومت کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا مگر یہ دور بھی فسادات سے خالی نہیں، دراصل حکومت کی انتظامی مشینری کے ارکان خصوصاً پی۔ اے۔ سی اور پولیس کا ذہن نہایت مسموم ہے اور وہ امن و امان قائم کرنے کے بجائے، یک طرفہ جارحانہ کاروائی کر کے ایک خاص فرقہ کے لوگوں کو زد و کوب کرتے ہیں، ان کا مال و اسباب لوٹتے ہیں اور ان کی املاک کو نقصان پہونچاتے ہیں، تعصب و تنگ نظری کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اترپردیش کے وزیر اعلیٰ مسٹر ملایم سنگھ یادو کا وجود غنیمت ہے ان کی مستعدی اولاً تو فساد ہی نہیں ہونے دیتی اور جو ہوتے ہیں ان پر بر وقت کارروائی کر کے قابو پالیا جاتا ہے، ضلع اعظم گڈھ کے موضع لُہرا میں ہونے والے فساد کے سلسلہ میں انھوں نے پھر اس کی پُرزور یقین دہانی کرائی ہے کہ ان کی حکومت اپنی اس پالیسی پر سختی سے قائم ہے کہ کسی جگہ بھی فساد ہو تو ضلع انتظامیہ کو جواب دہ قرار دیا جائے"، چنانچہ فساد میں ملوث بعض افسروں کو معطل کر کے انھوں نے عملاً یہ کر بھی دکھایا، ان کا یہ رویہ اور اقدام قابل ستائش بھی ہے اور لائق تقلید بھی۔

ممکن ہے ہندوستان میں فرقہ وارانہ منافرت اور شیخ و برہمن کی کشمکش کے کچھ اسباب و وجوہ ہوں لیکن شیعہ سنی فساد اور گرفتاران ابو بکرؓ و علیؓ کی باہمی آویزش اور پاکستان میں سندھیوں اور مہاجروں یا دوسروں کے درمیان ہونے والے ہولناک واقعات اور خوں ریز فسادات کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے؟

کراچی اور حیدر آباد (سندھ) میں رنگ و نسل کی بنیاد پر جارحیت، کشت و خون اور برادر کشی کا سیلاب امنڈ آیا ہے اور خود مسلمانوں ہی کا ایک گروہ ان کے دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا ہو گیا ہے، پاکستان کے اندرونی معاملات سے ایک ہندوستانی کو سروکار نہیں ہونا چاہیے لیکن اس شقاوت و سنگ دلی، ظلم و بے رحمی اور سفاکی و درندگی پر دنیا کے ہر مسلمان کی گردن شرم سے جھک گئی ہے، جو مذہب سارے انسانوں کے لیے سراپا رحمت تھا اسی کے ماننے والے باہم اس قدر کشت و خوں ریزی پر اتر آئے ہیں کہ انھیں اپنے مقدس رسول کا یہ فرمان بھی یاد نہیں رہا کہ لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض (میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو)

کیا ان خوں ریز فسادات اور مسلمانوں کے ایک طبقہ کے دوسرے طبقہ پر اس قدر منظم قاتلانہ حملے کے بعد پاکستانی حکومت اور عوام کو اس کا حق ہے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے چیخ و پکار مچائیں، ہندوستانی مسلمانوں کے مصائب پر پاکستان کے واویلا کرنے سے ان کا بھلا ہونا تو درکنار الٹے انھیں نقصان ہی پہونچا ہے، لیکن پاکستان کے خود غرض ارباب اقتدار کو اس کی پرواہی کہاں؟

دار المصنفین کی آمدنی کا اصل دار و مدار اس کی کتابوں کی تجارت پر ہے، لیکن یہ بات نہایت تشویش انگیز ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے بعض خود غرض اور بددیانت ناشرین اس کی کتابوں کو اجازت کے بغیر ہی چھاپ کر اسے مالی بحران میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں، یہ شرعاً، اخلاقاً کسی حیثیت سے بھی مناسب اور درست نہیں ہے، اگر یہ لوگ اپنی ناروا حرکتوں سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائیگی ہم کو افسوس ہے کہ دار المصنفین کی متعدد کتابیں عرصہ سے ختم ہو گئی ہیں اور انتہائی کوشش کے باوجود ابھی تک ان کو شائع نہیں کیا جا سکا ہے تاہم اس کی فکر برابر کی جا رہی ہے اور الحمد للہ اس کا آغاز بھی ہو گیا ہے حال ہی میں گل رعنا کا عکسی ایڈیشن شائع ہوا ہے اب الفاروق اور دوسری کتابوں کے عکسی ایڈیشن کی اشاعت پیش نظر ہے نئی کتابوں میں شذرات سلیمانی حصہ اول چھپ گئی ہے اسکے دوسرے حصوں کی کتابت بھی مکمل ہو گئی ہے تذکرۃ المحدثین حصہ سوم کی طباعت ہو رہی ہے تذکرہ فقہائے اسلام حصہ اول کی کتابت ہو چکی ہے اور مولانا سید سلیمان ندوی کے نام مشاہیر کے خطوط کے ذخیرہ

مقالات

شیخ نور الحق دہلوی کی شرح فارسی صحیح بخاری "تیسیر القاری"

از

ضیاء الدین اصلاحی

ہندوستان کے محدثین میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی کو جو امتیاز و تفوق حاصل ہے وہ اہل نظر اور اصحاب فن سے مخفی نہیں، ان کے خدمات حدیث کا دائرہ بہت وسیع اور گوناگوں ہے، ان کے بعد ان کی نسل میں کئی پشتوں تک علم حدیث سے شغف و انہماک قائم و باقی رہا، شیخ نور الحق دہلوی ان کے خلف الصدق اور لائق جانشین تھے، جن کے ذریعہ شیخ عبد الحق محدث کا فیض پوری طرح جاری رہا۔

شیخ نور الحق ایک بلند پایہ عالم و محدث اور صاحب کمالات شخص تھے، انھوں نے جو مفید تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں ان میں سب سے اہم اور ممتاز تصنیف تیسیر القاری ہے، ان کے والد بزرگوار نے مشکوٰۃ المصابیح کا ترجمہ و تشریح کر کے فارسی زبان میں احادیث کی شرح و تفہیم کے جس کام کی ابتدا کی تھی، ان کے فرزند اور خلف الرشید نے اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا، اور فارسی زبان میں بخاری شریف کا ترجمہ اور اس کی شرح لکھی، اس مضمون میں ان کی شرح بخاری کا جائزہ لے کر اس کے بعض امور و مباحث اور خصوصیات و ممیزات کو نمایاں کیا گیا ہے۔

تیسیر القاری کو شیخ نور الحق نے شہنشاہ ہند اورنگ زیب عالمگیرؒ کے نام معنون کیا تھا، اس کا وہی طرز و انداز ہے جو ان کے والد کی تصنیف شرح مشکوٰۃ کا ہے، یہ شرح دراصل ان ہی کے ایما سے لکھی گئی تھی، مولانا نور الحق خود تحریر فرماتے ہیں:

"والد ماجد چاہتے تھے کہ صحیح بخاری کی شرح و تعلیق بھی اسی رنگ کی فارسی زبان میں لکھی جائے، جیسا کہ وہ خود مشکوٰۃ المصابیح کی لکھ چکے تھے، اور جس کو بڑی شہرت اور غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی، اور تمام مسلمان اس کے فیوض سے بہرہ مند ہوئے، لیکن چونکہ ہر کام کا وقت مقرر ہوتا ہے اس لیے ان کی زندگی میں اس اہم اور عظیم الشان کام کو انجام دینے کی توفیق میسر نہیں ہوئی اور ان کے انتقال کے بعد استخارہ کر کے ان کے حکم کی تعمیل میں کمر ہمت باندھی گئی۔" (تیسیر القاری ج ۱ ص ۲)

شیخ نور الحق نے بخاری کی مروج و متداول شرحوں کرمانی، فتح الباری، عینی، سیوطی اور قسطلانی وغیرہ کو اپنا ماخذ بنایا اور ان سے مکمل استفادہ کیا، لیکن اس میں ان شرحوں کی طرح زیادہ اطناب و تفصیل سے کام نہیں لیا ہے، بلکہ فارسی زبان میں ضروری مقاصد و مطالب مکمل طور پر اس طرح بیان کر دینے کی کوشش کی ہے کہ بایہ کمال دانش سے قاصر طالبین کے لیے بھی مطالعہ بخاری سہل اور آسان ہو جائے، مولانا عبدالحی فرنگی محلی مرحوم لکھتے ہیں:

"گو بخاری شریف کی مفصل و مختصر شرحیں لکھی جا چکی تھیں، لیکن زبان کے فرق کی وجہ سے اہل عجم صحیح بخاری کی تحصیل اور اس کے اسرار و دقائق سے کماحقہ واقفیت سے قاصر و محروم تھے، تا آنکہ مولانا نور الحق نے اس کی فارسی شرح لکھی جس کا نام انھوں نے تیسیر القاری رکھا، جس میں مفید مطالب، عمدہ فوائد، لطیف مباحث اور دقیق غرائب بیان کیے، اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو مشکور بنائے اور انھیں جزائے خیر دے، کیونکہ انھوں نے تمام لوگوں کے لیے

صحیح بخاری کی تحصیل کو آسان کر دیا اور ہر قاری و سامع کے لیے اسے سہل بنا دیا۔"

(تیسیر القاری ج اول آغاز)

اصل شرح سے پہلے امام بخاریؒ کے حالات و سوانح، حدیث میں ان کے علوئے مرتبت اور دوسرے کمالات وغیرہ پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، اس کے بعد بخاری کی مرویات کا پہلے معنی خیز ترجمہ کیا ہے، پھر ان کی مختصر اور جامع تشریح کی ہے، یہ شرح و ترجمہ متن کے ساتھ نواب محمد علی خان بہادر صولت جنگ والی ریاست ٹونک کی توجہ سے مطبع علوی محمد علی بخش لکھنؤ سے شائع ہوا، پہلی جلد ۱۲۹۶ھ، دوسری ۱۲۹۹ھ اور چوتھی ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی ہے، یہی حصے ہمارے پیش نظر ہیں، جن کی تصحیح و تنقیح اور تزئین و آرائش کی خدمت مولوی محمد معشوق علی نے انجام دی ہے، حواشی پر خانوادۂ عبدالحق کے ایک بزرگ شیخ الاسلام کی شرح بخاری نیز حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے رسالہ تراجم الابواب اور اسماء الرجال بھی درج ہیں، پہلی جلد کے شروع میں مولانا عبدالحی فرنگی محلی اور بعض دوسرے حضرات کی تقریظیں بھی شامل ہیں، دوسری جلد کے آخر میں منثور و منظوم دونوں طرح کی تقریظیں درج ہیں۔

مولانا نور الحق کی شرح کی خوبیوں اور خصوصیات کو نمایاں کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مختلف حیثیتوں سے اس کا مفصل جائزہ لیا جائے، لیکن طوالت کے خوف سے ہم نے صرف پہلی جلد ہی تک اپنی بحث و گفتگو محدود رکھی ہے، اور اسی سے کچھ مثالیں اور نمونے پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

تیسیر القاری اور اشعۃ اللمعات محض ترجمے نہیں ہیں بلکہ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے جو یہ لکھا ہے کہ:

"حضرت شاہ عبدالحق محدث جس دور علم و تعلم کے بانی ہوئے اس کی ایک عام

خصوصیت یہ بھی ہے کہ علم حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو ملک کی عام زبان تھی تصنیف
و ترجمہ کی بنیاد ڈالی، خود شاہ صاحبؒ نے مشکوٰۃ وغیرہ کا ترجمہ کیا، پھر ان کے صاحبزادے
شیخ الاسلام نور الحق نے صحیح بخاری کا۔" (تذکرہ ۳۰۳ و ۳۰۴)
تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کتابیں صرف ترجمہ ہیں اور شرح نہیں ہیں، ذیل کی تحریر
تفصیل سے بھی واضح ہوگا کہ تیسیر القاری مجرد ترجمہ نہیں ہے۔

کتب کی ابتدا کے نوٹ | تیسیر القاری میں بخاری شریف کی کتب و ابواب کے شروع میں بطور تمہید
شارح نے ایک نوٹ تحریر کیا ہے، اس طرح کے نوٹ عموماً قابل غور اور لائق توجہ ہیں اور
ان سے اس شرح کی خصوصیتیں بھی ظاہر ہوتی ہیں،

امام بخاری نے اپنی صحیح کی ابتدا باب کیف کان بدء الوحی سے کی ہے اور
کتاب الوحی کا عنوان نہیں قائم کیا ہے، مولانا نور الحق اس کے شروع میں یہ نوٹ تحریر
فرماتے ہیں:

"مؤلف نے اپنی کتاب کی ابتدا میں وحی اور اس کے آغاز کے بارے میں جو حدیثیں
نقل کی ہیں ان کی حیثیت کتاب کے مقدمہ کی ہے، انھوں نے اس کو پسند نہیں کیا کہ خطبہ
یا کسی اور قسم کی بات کو ابتدا میں لاکر دوسرے لوگوں کی طرح کلام رسول پر اپنے کلام کو
مقدم کریں، انھوں نے بہت سے ابواب میں یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا ہے کہ حدیثوں ہی کو
ان کا عنوان بنایا ہے اور ان کی تائید کے لیے یا ان سے ربط کی بنا پر آیتیں نقل کی ہیں،
اس باب کے عنوان میں بھی انھوں نے آیت نقل کی ہے اور اس کے تحت جو حدیثیں لائے
ہیں ان میں آپ کی جانب کی جانے والی وحی کی صورت و کیفیت اور آپ تک اس کے
پہونچنے اور آنے کی شکل بیان کی گئی ہے، علاوہ ازیں مصنف نے اس سے بھی آگاہ کیا ہے

کہ وحی تمام انبیاء و رسل کی ایک مستمر خصوصیت و امتیاز ہے۔
امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کا آغاز حدیث الاعمال بالنیات سے کرکے
یہ واضح کیا ہے کہ صحیح نیت اور تقرب الی اللہ کے جذبہ کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کا یہ مجموعہ مرتب کرنے میں خود ان کی نیت پاکیزہ،
اور ارادہ صحیح رہا ہے، اسی طرح حدیث کی طلب و تحصیل کرنے والوں کو انھوں نے
بتایا ہے کہ وہ درست اور صحیح ارادہ سے اس کتاب کو شروع کریں" (تیسیر القاری ج ۱ ص ۱)

شارح کے اس نوٹ میں جن نکتوں کی نشاندہی کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ اس میں صحیح بخاری کے ابواب و کتب کی بعض منفرد اور انوکھی نوعیتیں اور
خصوصیتیں بتائی گئی ہیں۔

۲۔ شروع میں خطبۂ کتاب نہ تحریر کرنے کی وجہ بتائی ہے۔

۳۔ صحیح بخاری کا آغاز وحی سے متعلق روایتوں سے کیوں کیا گیا ہے؟ نیز ان حدیثوں
میں کس امر کا ذکر ہے؟

۴۔ الاعمال بالنیات سے صحیح بخاری کے آغاز کی کیا وجہ ہے؟

کتاب الایمان اور کتاب العلم کے شروع میں بھی مختصر نوٹ قلمبند کیا گیا ہے، اور
کتاب الوضو کی ابتدا میں جو نوٹ تحریر کیا گیا ہے اس میں پہلے اور بعد کی کتب و ابواب سے
صحیح بخاری کی باہمی مناسبت اس طرح واضح کی ہے:

"مصنف نے کتاب کو احادیث وحی سے شروع کیا تھا جو دینی احکام کی اصل الاصول
اور بنیادی سرچشمہ ہے، اس کے بعد ایمان کی حدیث لائے ہیں، کیونکہ تمام احکام کی اصل
و بنیاد وہی ہے، اس کے بعد احادیث علم کو بیان کیا ہے، کیونکہ احکام اسی سے وابستہ

ہوتے ہیں، اور جب احکام وعبادات کا بیان شروع کیا تو نماز کا ذکر دوسری عبادتوں سے پہلے اس لیے کیا ہے کہ وہ تمام عبادتوں میں سب سے افضل ہے، اور نماز سے پہلے طہارت کی حدیثیں اس لیے بیان کی ہیں کہ نماز کی سب سے اہم اور بڑی شرط یہی ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ شرط مشروط پر مقدم ہوتی ہے۔ (ج ۱ ص ۷)

بعض کتب وابواب کے شروع کا نوٹ قدرے طویل ہے، ان میں مختلف لغوی، علمی اور فقہی مسائل وغیرہ کا تذکرہ ہے، اس سلسلہ میں کتاب التہجد کا نوٹ ملاحظہ ہو:

"تہجد کے معنی ترک ہجود (خواب) ہے، جس طرح تأثم کے معنی ترک اثم (گناہ) کے ہیں، ابن فارس کا بیان ہے کہ متہجد رات میں نماز پڑھنے والے کو کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ جس کے معنی یہ ہیں کہ نماز میں قرآن پڑھنے کے لیے آخری شب میں خواب چھوڑ دو، اس حال میں کہ عام امت کے مقابلہ میں آپ کے لیے یہ ایک فریضہ سے زائد چیز ہے۔

مولف نے تہجد کی تفسیر سہر یعنی بیداری سے کی ہے، اور اسی معنی کے لیے یہ لفظ مشہور ہے، مگر لغت میں یہ لفظ اضداد میں سے ہے، یعنی خواب وبیداری دونوں معنی کے لیے آتا ہے، بعض لوگوں کے نزدیک تہجد کے معنی سونا اور ہجود کے معنی بیداری کے ہیں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ تہجد سونے کے بعد کی بیداری کو کہتے ہیں، سیوطی نے یہی معنی لیے ہیں۔

سفر السعادۃ میں علماء کے اس اختلاف کا ذکر ہے کہ شب میں قیام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھا یا سنت، دونوں ہی گروہ آیت بالا فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ سے استدلال کرتے ہیں، سنیت کے قائل لوگوں کے نزدیک نَافِلَةً کا لفظ

نفل نماز کے مفہوم میں ہے، جو عدم وجوب کے سلسلہ میں صریح وواضح ہے، لیکن اس استدلال میں کلام ہے، اس لیے کہ اگر نَافِلَةً نفل نماز کے معنی میں ہے تو لَكَ کی قید بے معنی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آپ کے ساتھ مخصوص ہے، اور نفل و تطوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، پس یہ لفظ زیادہ کے معنی میں ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے لیے تہجد کا وجوب فرائض پر ایک زائد امر ہے، ظاہر ہے مطلق زیادتی تطوع پر دلالت نہیں کرتی۔

وجوب کے قائل کہتے ہیں کہ فَتَهَجَّدْ صیغۂ امر وجوب کے لیے ہے، اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سفر وحضر، بیماری اور تندرستی ہر حال میں قیام لیل کرتے تھے، اور اگر کبھی کسی شدید بیماری یا نیند کے غلبہ کی وجہ سے قیام لیل نہیں کر سکے تو دن میں اس کی قضا کرتے تھے، یہ بات بھی اس کے وجوب کا ثبوت ہے، مگر یہ استدلال تکلف سے خالی نہیں ہے، کیونکہ امر اسی وقت وجوب کے لیے ہوتا ہے جب کوئی قرینہ اس سے پھیر دینے والا نہ ہو، یہاں اس کا قرینہ موجود ہے کہ شارع کے کلام میں لفظ نَافِلَةً کو معنی عرفی شرعی پر محمول کیا جائے اور لغت میں نافلة زائد کے معنی میں آتا ہے، اور لك کی قید سے ظاہر ہوتا ہے کہ خطاب آپ سے مخصوص ہے اس عمل پر آپ کی مواظبت اور فوت ہونے کی صورت میں قضا کو بھی دلیل نہیں بنایا جا سکتا، رمضان کے عشرۂ اخیرہ میں اعتکاف کی نوعیت بھی بعینہ یہی ہے، جو بالاتفاق سنت ہے۔ اس لیے بظاہر سنیت کا قول صریح ہے۔

شارح قسطلانی کا بیان ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تہجد واجب تھی، اور آپ اس کے لیے مامور تھے، لیکن

امت کے لیے یہ واجب نہ تھی، امام نووی کا بیان ہے کہ امت کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی یہ وجوب منسوخ ہوگیا تھا، صحیح مسلم میں حضرت عائشہؓ سے بھی یہی مروی ہے کہ نَافِلَةً لَّكَ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چیز آپؐ کے لیے فضیلت کے طور پر تھی، کیونکہ آپؐ کے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دیے گئے تھے، پس یہ نماز نہ تو آپ کیلئے مکفر ذنوب تھی اور نہ محض فضل وکثرت ثواب کے لیے تھی، دنیا میں آپ کی نماز کی مثال اسی طرح ہے جس طرح عالم آخرت میں اہل جنت کے لیے تسبیح، جس میں کسی طرح کی کلفت ومشقت نہ ہوگی۔

امام الحرمین اور قاضی ابوبکر باقلانی کے اقوال سے یہ متفرع ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اس کا وجوب ثابت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جو چیز خدا نے واجب کی ہے، وہ واجب ہے، خواہ اس کے ترک پر وعید نہ ہو، کیونکہ ترک وعید بقائے وجوب کے منافی نہیں ہے، آپؐ کے قلب کو ان تکالیف سے آرام واطمینان نصیب ہوتا تھا، اور آپ انھیں مغفرت کے خیال یا خوف وعید کی بنا پر نہیں کرتے تھے، کیونکہ آپؐ بہرحال معصوم تھے، اور عیب وگناہ سے آپؐ کا دامن آلودہ نہیں ہوا تھا، آپ کو استغفار کا جو حکم دیا گیا ہے جیسے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ وہ فرضاً وتقدیراً ہے، یعنی اگر بالفرض تم گناہ میں پڑ گئے اور میری عصمت تم کو میسر نہ آئی تو میں تمھیں بخش دوں گا۔

حاصل کلام یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اور برابر امت کے غم میں فکرمند اور بے چین رہتے تھے، جیسا کہ آپؐ کے ارشاد شَيَّبَتْنِي سُورَةُ هُودٍ سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ ہود کی آیت فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَمَنْ

تَابَ مَعَكَ کے نازل ہونے کے بعد آپؐ کی پیری کا پتہ چلا کہ وہ امت کی عدم استقامت کے غم واندیشہ کا نتیجہ تھی، اس بنا پر خدائے مہربان نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ امت کے لیے آپؐ استغفار کریں، تاکہ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استغفار مراتب ودرجات کی ترقی اور قربت حق کے انعام کے لیے تھا، جس کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے، آپؐ کا ارشاد ہے

انه ليغان على قلبي، واني لاستغفر الله سبعين مرة. — میرے دل پر پردہ پڑ جاتا تھا، اور میں اللہ تعالیٰ سے ستر بار استغفار کرتا تھا۔

شارحین کہتے ہیں کہ پردہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ خدا اور آپؐ کے درمیان حائل اور حجاب ہوتا تھا، کیونکہ سیر فی اللہ کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے، آپؐ جس عالی مقام پر پہونچتے تھے اس سے برتر مقام آپؐ کو نظر آتا تھا اور آپؐ موجودہ مقام کو پست سمجھنے لگتے تھے، اسی کو آپؐ نے حجاب سے تعبیر کیا ہے، توجہ تام کے بعد جو حمد واستغفار سے عبارت ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اعلیٰ مقام کی جانب ترقی ہونی چاہیے، غرض سیر کے ہر مرتبہ ودرجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آناً فاناً برابر ترقی فرماتے رہتے تھے، حالانکہ آپ جس مقام پر بھی ہوتے اور تقرب الٰہی کے جس درجہ پر بھی فائز ہوتے وہاں تک کوئی عارف اور مقرب بندہ نہیں پہونچ سکتا ہے، اللہ ہی کو اس کی اصل حقیقت کا علم ہے، اور حدیث نبوی لی مع الله وقت میں بھی غالباً اسی معنی کی طرف اشارہ ہے"

(ج ۱، ص ۳۷۴ - ۳۷۵)

استنباط واخذ مسائل | شارح نے احادیث کی شرح وتوضیح کرتے ہوئے ان سے کہیں کہیں مفید

استنباط اور دلچسپ نتائج اخذ کیے ہیں، ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لینا مفید ہوگا۔

صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے حضرت عدی کو لکھا کہ ایمان کے فرائض، شرائع، حدود اور سنن ہیں، جس نے ان کو کمال تک پہونچایا اس نے ایمان کو کمال تک پہونچایا، اور جس نے ان کو تمام وکمال تک نہیں پہونچایا اس نے ایمان کو تمام وکمال تک نہیں پہونچایا، اس سے شارح کا یہ استنباط ملاحظہ ہو:

"حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا یہ قول اس پر دلالت کرتا ہے کہ تصدیق واعمال ایمان کامل میں داخل ہیں، جیسا کہ معمولی فہم ودانش سے یہ بات ظاہر ہے۔" (ج۱ ص ۱۷)

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے اس قول کے بعد مصنفؒ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

اجلس بنا نؤمن ساعة. ہمارے ساتھ چندے نشست اختیار کرو، تاکہ ہم امور آخرت واحکام دین کا ذکر کرکے ایمان کی زیادتی کا سامان کریں ...

مولانا نور الحق فرماتے ہیں کہ:

"اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امور دین ایمان میں داخل ہیں، نؤمن سے ظاہر ہے کہ تجدید ایمان مراد ہے۔" (ص ۱۷)

آگے امام بخاریؒ حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ "بندۂ مومن کی رسائی تقویٰ کی حقیقت تک اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک وہ ان چیزوں کو بھی نہ چھوڑ دے جو اس کے سینے میں کھٹکیں اور خلجان پیدا کریں"۔ اس کے متعلق حضرت شیخ نور الحق فرماتے ہیں کہ:

"اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض مومنین ایمان کی حقیقت اور کنہ تک پہونچ جاتے ہیں

اور بعض نہیں پہونچتے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان متجزی ہے، اس کے اجزاء ہوسکتے ہیں۔" (ص ۱۷)

امام بخاریؒ نے تحویل قبلہ کے بیان میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کی جانب رُخ کرکے سب سے پہلے عصر کی نماز پڑھی، آپ کے ساتھ اس نماز کو پڑھنے والے لوگوں میں سے ایک صاحب کسی اور مسجد کے پاس سے گذرے، جہاں لوگ رکوع میں تھے، تو انھوں نے فرمایا کہ میں اللہ کی گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ کی جانب رخ کرکے نماز پڑھی ہے، شیخ نور الحق اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ

"یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ دیانات میں خواہ وہ فرائض ہی کیوں نہ ہوں، ایک شخص کی بات پر بھی عمل کیا جاسکتا ہے۔" (ج۱، ص ۳۰)

امام بخاریؒ نے کتاب الایمان میں ایک باب یہ قائم کیا ہے کہ "فتنہ اور آزمائش کی جگہ سے فرار اختیار کرنا بھی دین وایمان میں داخل ہے"۔ اس سلسلہ میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی یہ حدیث درج کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "قریب ہے کہ مسلمان کا بہترین مال بکریوں کا وہ گلہ ہو جس کو لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور پانی کی جگہوں میں گوشوں اور صحراؤں میں بھاگ جائے تاکہ وہ اپنے دین کو فتنوں اور آزمائشوں سے بچالے"۔

شیخ نور الحق اس کی شرح میں ان نکتوں کی نشاندہی کرتے ہیں:

"اس میں سلف کا اختلاف ہے کہ خلق سے عزلت وانزوا بہتر ہے، یا ان کے درمیان رہنا، بعض لوگوں نے عزلت کے فائدوں کو مدنظر رکھ کر کہا ہے کہ خلق سے انقطاع میں شر وفساد سے سلامتی رہتی ہے، اور طاعت وعبادت، جمعیت باطن اور ذکر الٰہی کے لیے وقت فارغ رہتا ہے، اس میں آدمی کو اپنی حالت کے لحاظ سے اخلاص وعمل کا موقع ملتا ہے اس لیے

عزلت ہی بہتر ہے، لیکن جن لوگوں کی نظر اختلاط وصحبت کے ان فوائد پر ہے کہ اس میں علم دین کو سیکھنے اور سکھانے کی توفیق ملتی ہے، لوگوں کی داد وتحسین نصیب ہوتی ہے، ان کی جفا وایذا پر صبر وتحمل کا اجر ملتا ہے، اور ان کے ساتھ تواضع سے پیش آنے، بیماروں کی عیادت، جنازہ میں شرکت ومشایعت، جمعہ اور فرض نمازوں کی جماعت میں حاضری کا موقع میسر آتا ہے، وغیرہ وغیرہ تو وہ لوگ ان دینی فوائد ومصالح کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ اختلاط اور خلق کے اندر رہنا ہی پسندیدہ اور بہتر ہے، وَكُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ (ج ۱ ص ۲۱ و ۲۲)

دفع تعارض | شیخ نور الحق نے اپنی شرح میں احادیث کے ظاہری تضاد کو بھی رفع کیا ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جب حضرت جبرئیلؑ پہلی بار وحی لے کر آئے تو آپؐ پر جو اضطرابی کیفیت طاری ہوئی اس کے ازالہ کے لیے حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو تسلی دینے اور آپ کی وحشت کو دور کرنے والی جو باتیں فرمائیں ان میں آپؐ کے ان مکارم اخلاق اور عمدہ اوصاف کا خاص طور پر ذکر کیا جو آپؐ میں بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے، اور جن کا انھوں نے اچھی طرح مشاہدہ کیا تھا، حضرت خدیجہؓ کا استدلال اس طور پر تھا کہ آپؐ کے ان اوصاف حمیدہ کے ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ ہرگز آپ کو بے سہارا نہ چھوڑے گا، اور نہ آپ جیسے عمدہ اطوار وعادات کے آدمی کو اللہ ذلیل وخوار اور بے یار ومددگار کرے گا۔ شیخ نور الحق اس حدیث سے اولاً تو یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ واقعی اگر کسی کے اندر مدح وستائش کے لائق باتیں ہوں تو انھیں اس کے سامنے بیان کرنا روا ہے، اور اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، رہی وہ حدیث جس میں اس کے برعکس یہ کہا گیا ہے کہ

"سامنے تعریف کرنے والے کے منہ میں خاک ڈال دو"

تو یہ حکم ایسے شخص کے ساتھ مخصوص ہے جو مدح وستائش کو اپنا شیوہ اور شعار بنا لے، یہ بلاشبہہ

ایک نامناسب فعل ہے (ج ۱، ص ۹)

صحیح بخاری کی کتاب الایمان میں حضرت ابو سعید خدریؓ کے واسطے سے یہ حدیث بیان کی گئی ہے کہ "ایک نیکی کا بدلہ دس سے لے کر سات سو گنا تک ملتا ہے، شارح فرماتے ہیں کہ عدد کی اس صراحت وقطعیت سے اس کے سوا کی نفی مقصود نہیں ہے، اس بنا پر یہ حدیث اس حدیث کے معارض نہیں ہے جس کو مصنف باب رقاق میں لائے ہیں، کہ "سات سو سے بہت زیادہ گنا اجر ملتا ہے، کیونکہ تضعیف کا معاملہ اللہ کے فضل وارادہ سے جڑا ہوا ہے، وہ جس کو جس قدر چاہتا ہے عطا کرتا ہے" (ص ۳۰)

مشہور حدیث ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان، اسلام اور احسان کے بارے میں سوال کیا، امام بخاریؒ نے اسلام کے متعلق ایک ایسی روایت بھی نقل کی ہے جس میں حج کا ذکر نہیں ہے، جب کہ دوسری حدیثوں میں اور عبادات کی طرح اس کا بھی ذکر ہے، اس کو بعض لوگوں نے راوی کے سہو ونسیان کا نتیجہ بتایا ہے۔ شیخ نور الحق فرماتے ہیں:

"بخاری کے رُواۃ میں اس طرح کے احتمال کو راہ دینا نامناسب اور بعید ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس وقت آپ نے یہ فرمایا تھا اس وقت حج فرض نہیں ہوا تھا، اس سے ابن مندہ کی وہ تصریح باطل ہو جاتی ہے جس کو انھوں نے ایسی سند سے بیان کیا ہے، جو امام مسلمؒ کی شرط کے مطابق ہے، اور جس میں وضاحت کے ساتھ یہ مذکور ہے کہ حضرت جبرئیلؑ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے آخری زمانے میں تشریف لائے تھے، حضرت جبرئیلؑ کے اس واقعہ سے متعلق بعض روایتوں میں کچھ مزید اعمال کا ذکر بھی ہے، لیکن بعض میں ان سے کم اعمال کا ذکر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اختلاف سائل کے سوال

اور بمقتضائے حال کے اعتبار سے تھا، واللہ اعلم" (ج۱، ص ۳۵)

اشکالات کے جواب شیخ نور الحق نے بعض جگہ شکوک و شبہات اور اشکالات کے جواب بھی دیے ہیں، جس میں وہ عام شارحین کی رائے سے یک گونہ اختلاف کرتے ہیں، مثلاً حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی سچے دل سے گواہی دینے والا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس پر اللہ نے آگ کو حرام نہ کر دیا ہو۔

حضرت معاذؓ نے آپؐ کا یہ ارشاد سن کر فرمایا: "اے اللہ کے رسول کیا میں لوگوں کو اس سے مطلع نہ کر دوں، تاکہ وہ بشارت سن لیں"، آپؐ نے فرمایا: "تب تو لوگ اسی پر بھروسہ کرلیں گے اور عمل سے دستکش ہو جائیں گے"، اس کے بعد اسی روایت میں ہے کہ حضرت معاذؓ نے اپنی وفات کے وقت کتمان علم کے گناہ کے اندیشہ سے یہ بات بیان کر دی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبر کے حکم کی تعمیل نہ کرنا بھی تو ایک گناہ ہے حضرت معاذؓ نے جب اس کی خبر دے دی تو وہ اس گناہ کے مرتکب ہو گئے، شیخ نور الحق اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ آپؐ کی نہی تحریمی کے بجائے تنزیہی تھی، اور کتمان علم کی نہی تحریمی ہے حضرت معاذؓ مجتہدین صحابہ میں سے تھے، اس لیے آخر میں انھوں نے اس کو ترجیح دے کر اس پر عمل کیا۔

شارحین کہتے ہیں کہ امر ایجابی ہے اور نہی اتکال (تکیہ اور بھروسہ کرنے) سے مقید و مشروط ہے، حضرت معاذؓ چونکہ دین میں کوہ راسخ تھے اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یہ مژدۂ جانفزا سنایا اور ہر شخص کو اسے سنانے سے منع فرمایا، چنانچہ انھوں نے اس کی خبر ایسے شخص کو دی ہوگی جس کے بارے میں انھیں اس کا اندیشہ نہ رہا ہوگا کہ وہ اس پر بھروسہ کرلے گا،

مگر شیخ نور الحق کے نزدیک یہ جواب پُر از تکلف ہے، وہ فرماتے ہیں کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ آخر حضرت معاذؓ نے کیوں مدۃ العمر اس سے ان لوگوں کو مطلع نہیں کیا جن کے بارے میں بھروسہ کر لینے کا وہم و گمان نہیں تھا، ظاہر بات ہے کہ اس طرح کے لوگ ان کے زمانے میں بے شمار رہے ہوں گے، دوسری بات یہ ہے کہ بالآخر یہ اطلاع خاص و عام ہر شخص کو ہو ہی گئی، پس جس نے بھی اس کو مشتہر کیا ہو اس نے گویا اس ایجابی حکم کی خلاف ورزی کی"۔

(ج۱، ص ۶۹)

شارحین کے اقوال سے بے اطمینانی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نور الحق نے اپنی شرح میں صرف شارحین کے اقوال و آراء ہی نہیں تحریر کیے ہیں، بلکہ ان پر بحث و تبصرہ بھی کیا ہے اور ان کا ناقدانہ جائزہ بھی لیا ہے، اور جہاں ان کی رائے سے اختلاف کیا ہے وہاں اپنی رائے و تحقیق کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے، مثلاً امام بخاریؒ نے بچوں کے وضو کے متعلق حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ انھوں نے اپنی خالہ حضرت میمونہؓ کے یہاں ایک رات بسر کی، وہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی سوئے تھے، رات کا کچھ حصہ گذرا تو آپؐ بیدار ہوئے اور وضو کر کے نماز پڑھنے لگے، آپؐ کو دیکھ کر میں بھی اٹھا، اور آپؐ ہی کی طرح وضو کر کے نماز پڑھنے کے لیے آپؐ کی بائیں جانب کھڑا ہو گیا، آپؐ نے مجھے اپنے دائیں کر لیا، اور اس کے بعد آپؐ لیٹ گئے اور سو گئے، یہاں تک کہ آپؐ کی سانس کی آواز آنے لگی، جب اذان ہوئی تو آپؐ نماز کے لیے اٹھے اور وضو کیے بغیر نماز ادا کی، شیخ نور الحق اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے جو یہ کہا ہے کہ "میں نے آپؐ ہی کی طرح سے وضو کیا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباسؓ کے وضو کو روا اور نماز کو جائز قرار دیا، حالانکہ اس وقت وہ -

چھوٹے تھے، شارح قسطلانی نے یہاں اس تردد کا ذکر کیا ہے کہ مصنف نے صبی (بچے) کے وضو کا حکم نہیں بیان کیا ہے کہ وہ واجب ہے یا مستحب؟ اگر واجب ہے تو لازم آتا ہے کہ اس کے ترک پر بچہ سزا پائے گا، اور اگر مندوب ہے تو گویا بغیر وضو اس کی نماز صحیح ہو جائیگی، قسطلانی کے خیال میں اسی اشکال سے بچنے کے لیے مصنف نے سکوت اختیار کیا ہے، مولانا نور الحق فرماتے ہیں کہ اس سکوت کے باوجود یہ اشکال باقی رہتا ہے، اس لیے ذہین لوگوں کے لیے اسے دفع کرنا ضروری ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "بچہ کا وضو مندوب اور اس کی مندوب نماز کے لیے شرط ہے" (ج ا ص ۲۹۰ و ۲۹۱)

امام بخاریؒ نے کتاب التیمم میں یہ حدیث نقل کی ہے کہ

اعطیت خمسا لم یعطهن — مجھے ایسی پانچ چیزیں دی گئی ہیں جو
احد قبلی۔ — مجھ سے پہلے کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں

مولانا نور الحق فرماتے ہیں کہ کتب سیر میں آپ کے بے شمار خصائص مذکور ہیں، ان پانچوں کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ شارحین کہتے ہیں کہ کسی چیز کو عدد کے ساتھ معین کرنے سے ماسوا کی نفی و تردید نہیں ہوتی، پس یہ حدیث ان حدیثوں کے معارض نہیں ہے جن میں آپ کی مزید خصوصیات کا ذکر ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دوسری خصوصیات کی اطلاع آپ کو اس کے بعد ہوئی ہو۔

شیخ نور الحق کو ان دونوں باتوں سے تشفی نہیں ہوتی، وہ فرماتے ہیں کہ پانچ ہی چیزوں پر اکتفا کی یہ کوئی مناسب توجیہ نہیں ہے (ج ا ص ۱۲۹)

کتاب الجنائز کی ایک حدیث کا فقرہ ہے:

واللہ ما ادری وانا رسول اللہ — بخدا اللہ کا رسول ہوتے ہوئے بھی مجھ کو

ما یفعل بی۔ — معلوم نہیں ہے کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔

شیخ فرماتے ہیں کہ یہ بات محض جذبۂ عبودیت اور تقاضائے ادب و بندگی کی وجہ سے آپؐ نے فرمائی ہے، اور اس واسطے بھی کہ دوسرے لوگ متنبہ ہو جائیں اور فضول کاموں کے مرتکب نہ ہوں، ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی علوئے شان و منزلت وحی متلو و غیر متلو دونوں میں وارد ہے، اور آپؐ بالیقین جانتے تھے کہ آپؐ قیامت کے دن تمام نبیوں سے معزز اور شافع و مشفع ہوں گے۔

شارحین کا خیال ہے کہ یہ بات سورۂ فتح کی آیت لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ سے پہلے کی ہے، جب آپؐ کو اپنے اچھے انجام کی خبر نہیں تھی، بعد میں تو آپؐ کو نہ صرف اپنے بلکہ عشرۂ مبشرہ کے حسن انجام کا بھی علم ہو گیا تھا، لیکن جس وقت آپؐ نے یہ فرمایا تھا اس زمانے میں آپؐ اپنی مغفرت و عدم مغفرت کے بارے میں متردد تھے۔

شیخ نور الحق اس توجیہ پر بے اطمینانی ظاہر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ بات اہل ایمان کے عقیدت مند دل میں کبھی متمکن نہیں ہو سکتی کہ آپؐ کے آخری دور میں ہونے والی صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہونے والی اس آیت سے پہلے آپ اپنے انجام کے بارے میں متردد ہو رہے ہوں، باوجودیکہ آپؐ خدا کے مقرب اور اس کے گوناگوں انعامات کے مورد تھے، آپؐ سے اس قسم کا سوئے ظن رکھنے والا ہی اس توجیہ کو پسند کر سکتا ہے، کرمانی وغیرہ کا یہ خیال بھی بے معنی ہے کہ یہ بات سورۂ فتح کی آیت سے منسوخ ہو گئی ہے، کیونکہ اس حدیث میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ خبر ہے جس میں نسخ نہیں ہوتا۔

قرطبی وغیرہ نے کہا ہے کہ آپ کی مراد یہ ہے کہ مجھے خبر نہیں کہ میرے اور تمھارے ساتھ دنیا میں نفع وضرر کا کیا معاملہ ہوگا، واضح رہے کہ اس توجیہ سے حدیث کا سیاق ابا کر رہا ہے، بیضاوی کے نزدیک اس سے دارین کے احوال کی تفصیل مراد ہے، کیونکہ آپ کو تفصیل کے بارے میں کوئی واقفیت نہ تھی، اس بنا پر کہ غیب کی تمام باتوں کا علم اللہ کے لیے مخصوص ہے، بعض روایتوں میں مایفعل بی کے بجائے بہ آیا ہے، اس صورت میں ضمیر کا مرجع حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف ہوگا، فتح الباری میں لیث کے واسطہ سے اس روایت کی صحت میں کچھ کلام کیا گیا ہے، غرض اس کی متعدد تکلف پر مبنی توجیہات کی گئی ہیں، واللہ اعلم (ج۱، ص ۴۱۶)

فقہی اختلافات کا ذکر اور حنفی مذہب کی تائید و ترجیح

وہ اس شرح میں فقہاء کے اقوال وآرا اور مختلف فقہی مذاہب کو بھی جابجا بیان کرتے ہیں، اور چونکہ خود حنفی المذہب تھے اس لیے اس مذہب کو دلائل سے مرجح و افضل بتاتے ہیں، چند مثالوں سے اس کی وضاحت ہوگی

صحیح بخاری میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے، کہ "قضائے حاجت کے وقت قبلہ کی طرف منھ یا پیٹھ نہیں کرنی چاہیے" اس کے متعلق شیخ نور الحق ارشاد فرماتے ہیں:

"یہ بات مخفی نہ ہوگی کہ اس حدیث میں نہی عام ہے، جس میں صحرا وغیرہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے، اسی کو امام ابو حنیفہ، مجاہد، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری اور ایک روایت کے مطابق امام احمد نے اختیار کیا ہے، اور قیاس بھی اسی کا متقاضی ہے کہ نہی قبلہ کی تعظیم کی وجہ سے ہے، جس کا استقبال واستدبار صحرا میں بھی ہوتا ہے اور عمارت کے اندر بھی، اور اگر اس میں حائل کا اعتبار کیا جائے تو صحرا میں بھی پہاڑ اور عمارتیں حائل ہوسکتی ہیں،

امام شافعی و امام مالک نے اس عموم کو حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث سے خاص کر دیا ہے، جس سے مکانوں میں اس کا لحاظ نہ کیے جانے کی گنجائش ملتی ہے، لیکن عروہ ابن زبیر اور ابو داؤد حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث کو منسوخ مانتے ہیں (تیسیر القاری ج۱ ص ۵۰)

تیمم کے بیان میں شارح لکھتے ہیں:

"مصنف اس کتاب میں جو حدیثیں لائے ہیں، ان میں ایک ہی ضربہ اور مسح کفین (ایک مرتبہ مٹی پر ہاتھ مار کر اسی سے منھ اور دونوں ہتھیلیوں کو پونچھ لینے) کا ذکر ہے، محدثین اور امام احمد کا یہی مذہب ہے، ان حضرات کے نزدیک دوسری ضرب اور مسح ذراعین واجب نہیں ہے، لیکن مشہور مسلک یہ ہے کہ تیمم میں دو ضربہ ہے، ایک منھ کے لیے اور دوسرا کلائیوں سے کہنیوں تک کے لیے ہے، اس کے ثبوت میں بہت سی صحیح حدیثیں موجود ہیں، بعض ناقدین فن کا خیال ہے کہ پہلا مذہب دلیل کے لحاظ سے اور دوسرا قیاس کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے، امام خطابی فرماتے ہیں کہ کفین پر اکتفا کرنا حسب روایت زیادہ صحیح ہے، اور اصول وقیاس کے اعتبار سے تیمم میں ذراعین کا وجوب اشبہ ہے۔

اس پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ قیاس کو نص کے مساوی قرار دینا غلط اور فاسد ہے، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو ہمارا دار ومدار صرف قیاس پر نہیں ہے، بلکہ وہ محض ایک وجہ ترجیح ہے، کیونکہ جو روایت قیاس کے موافق ہو اس کو اس روایت پر ترجیح حاصل ہوگی، جو قیاس کے موافق نہ ہو، ثانیاً یہ کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی حدیث مضطرب ہے جو لائق احتجاج نہیں، ان کی ایک روایت میں کفین اور دوسری میں ذراعین کا ذکر ہے ابو داؤد نے ان سے جو روایت کی ہے اس میں یدین سے نصف ذراع تک کا ذکر ہے

اور وہ مرفق (کہنی) کے ذکر سے خالی ہے، مگر دوسری میں مرفقین (دونوں کہنیوں) تک کا ذکر ہے، ابو داؤد اور نسائی کی ایک روایت میں ابطین (بغلوں) اور مناکب (کندھوں) تک کا ذکر بھی ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ تیمم کے مسئلہ میں جس قدر حدیثیں مروی ہیں ان میں ابو جہیم رضؓ اور عمار رضؓ کی حدیثوں کے سوا سب ضعیف اور مختلف فیہ ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً اسی قدر مذکور ہے، شرح سفر السعادۃ میں اس پر اس سے زیادہ شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے، اور ضربتین کے بارے میں حدیثیں صحاح سے منقول ہیں" (ص ۱۳۱)

امام بخاریؒ نے اذان کے شفعاً (اذان کے لفظوں کو جفت کہنے) اور اقامت کے وتراً (طاق کہے جانے) کے متعلق حضرت انس رضؓ کی حدیث بیان کی ہے، شیخ نور الحق تحریر فرماتے ہیں کہ:

"امام ترمذیؒ اس حدیث کو صحیح قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ بعض صحابہ وتابعین اور امام مالکؒ، شافعیؒ، احمدؒ اور اسحاقؒ اسی کے قائل ہیں، دوسری حدیث جس کو عبد الرحمٰن ابن ابی لیلیٰ نے عبد اللہ ابن زبیر رضؓ سے بیان کیا ہے یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اذان شفعاً شفعاً (جفت) اور اقامت مثنیٰ مثنیٰ (دو دو بار) ہوتی تھی، اس کے قائل سفیان ثوری، ابن مبارک اور اہل کوفہ یعنی حنفیہ وغیرہ ہیں، شیخ ابن ہمام فرماتے ہیں کہ ابو داؤد میں صحیح سند سے وارد ہے کہ اقامت بھی مثنیٰ مثنیٰ (دو دو بار) ہے، حدیث میں ایتار (طاق) کا جو لفظ آیا ہے اس کا دو مفہوم ہے، ایک یہ کہ ایتار لفظاً ہو، یعنی اقامت کے الفاظ وتر (طاق) کہے جائیں، دوسرے یہ کہ ایتار صورتاً ہو، یعنی الفاظ جلدی جلدی اور تیزی سے کہے جائیں، یہاں یہی دوسرے معنی مراد ہوں گے، اس لیے کہ اگر پہلے معنی مراد لیے جائیں

تو یہ بات ان حدیثوں کے معارض ہوگی جن میں تثنیہ (دو دو بار) کا ذکر صراحۃً موجود ہے، پس معلوم ہوا کہ اقامت کے کلمات بھی دو بار کہے جائیں گے، اس بنا پر دوسرے معنی مراد لینا ضروری ہے تاکہ دونوں روایتوں میں تعارض نہ رہے، وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ عہد نبیؐ سے قبل اقامت بھی اذان ہی کی طرح کہی جاتی تھی، مگر اموی خلفاء نے عجلت اور جلد بازی کی وجہ سے اسے ایک ہی بار کہنا شروع کیا، طحاوی وبیہقی کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے یہ روایت نقل کی ہے کہ اقامت واذان مثنیٰ مثنیٰ ہے، یہ پورا مقالہ شیخ عبد الحق کی فتح المنان فی تائید مذہب النعمان میں موجود ہے" (ج ۱، ص ۲۱۷)

امام بخاریؒ نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضؓ کی ایک حدیث بیان کی ہے، جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت معاذ بن جبل رضؓ کے نماز پڑھنے کے بعد اپنی قوم کو نماز پڑھانے کا ذکر ہے، اس حدیث کے ترجمہ وتشریح کے ضمن میں شیخ نور الحق نے فقہاء کے اس اختلاف کا ذکر کیا ہے کہ کیا فرض پڑھنے والے نفل پڑھنے والے کی اقتدا کر سکتے ہیں یا نہیں؟ شیخ فرماتے ہیں کہ:

"شوافع کا مذہب یہ ہے کہ فرض ادا کرنے والے کے لیے نفل پڑھنے والے کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے، مگر حنفیہ کے نزدیک یہ درست نہیں ہے، شافعیہ کی دلیل یہی حدیث ہے جو ان کے نزدیک قوی ترین حجت ہے، ان کا استدلال یہ ہے کہ حضرت معاذ رضؓ نبی اکرمؐ کے پیچھے جو نماز پڑھتے تھے وہ فرض تھی، اور جو نماز اپنی قوم میں آکر پڑھتے تھے وہ ان کی تو نفل مگر ان کے مقتدیوں کی فرض ہوتی تھی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ان کا معاملہ پیش ہوا تو آپ نے ان کی امامت پر ناگواری نہیں ظاہر کی بلکہ انھیں طویل قراءت سے منع کیا، اس سے لازماً یہ ثابت ہوتا ہے کہ فرض پڑھنے والوں کی نماز نفل نماز پڑھنے والے

کے پیچھے ادا ہوجاتی ہے، حنفیہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اولاً تو یہ حدیث منسوخ اور اس زمانے کی ہے جب ایک ہی روز میں ایک فرض کو دوبارہ ادا کرنا روا تھا، لیکن بعد میں یہ حکم تبدیل اور منسوخ ہوگیا، جیسا کہ امام طحاویؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ انھوں نے ایک دن میں ایک ہی فرض کو دوبار پڑھنے سے منع کیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ نہی اباحت کے بعد ہی ہوسکتی ہے۔

جب دو حدیثیں معارض ہوں اور ان میں جمع وتطبیق ممکن نہ ہو تو ایک کو دوسری پر ترجیح دینا ہوگا، یہاں ترجیح کی ایک وجہ حدیث کی قیاس سے موافقت بھی ہے، اور مآل ترجیح نسخ ہے، دوسری بات یہ ہے کہ شوافع کے استدلال کی بنیاد اس پر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کی امامت پر ناگواری نہیں ظاہر کی، اس کی وجہ ممکن ہے یہ رہی ہو کہ آپؐ کو اس کا علم ہی نہ رہا ہو کہ حضرت معاذؓ آپ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، اس کی دلیل وہ حدیث بھی ہے جس کی روایت احمد نے سلیم سے کی ہے کہ "اے معاذؓ! فتنہ میں ڈالنے والے نہ بنو، یا تو میرے ساتھ نماز پڑھو یا لوگوں کو مختصر نماز پڑھاؤ" یعنی دونوں میں سے ایک بات کو اختیار کرو۔

یہ بھی احتمال ہے کہ آپؐ نے حضرت معاذؓ کو ان کی قوم کی امامت پر مامور کیا ہو لیکن وہ کبھی کبھی احکام وآداب سیکھنے اور ثواب حاصل کرنے کے لیے نفل کی نیت سے آپ کے ساتھ بھی نماز ادا کرلیا کرتے رہے ہوں، واللہ اعلم، یہ پوری بحث فتح المنان سے منقول ہے۔" (ج ۱ ص ۲۴۵)

شیخ نورالحق غالی حنفی نہ تھے | عموماً شیخ عبدالحق اور ان کے خلف الصدق شیخ نورالحق کو غالی اور متشدد حنفی کہا جاتا ہے، لیکن جو مثالیں پیش کی گئی ہیں ان سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا،

اس میں شبہہ نہیں کہ یہ دونوں بزرگ حنفی المذہب تھے اور اپنے مذہب کی تائید وحمایت بھی کرتے تھے، اور دلائل وشواہد سے دوسرے مذاہب پر اسے ترجیح دیتے تھے، مگر عام اہل تقلید اور مذاہب کے معاملہ میں غلو اختیار کرنے والوں کی طرح نہ اپنے مذہب کی جا و بیجا حمایت کرتے تھے اور نہ اس شدت وتعصب کا مظاہرہ کرتے تھے جو مقلدین اور عام اہل مذاہب کا شیوہ ہے۔

ذیل میں ہم ایک ایسی مثال پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ اپنے مذہب و مسلک سے ان کا شغف وانہماک چاہے جتنا بھی بڑھا ہوا ہو، مگر اس کے باوجود وہ حق وانصاف پسند تھے۔

رکوع سے پہلے اور اس کے بعد میں رفع یدین (دونوں ہاتھوں کو اٹھانے) کے بارے میں احناف اور دوسرے مذاہب کا اختلاف بہت مشہور ہے، امام بخاریؒ نے رفع یدین کے ثبوت میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی حدیث نقل کرکے صراحت کی ہے کہ وہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً بیان کرتے تھے، شیخ نورالحق اس سلسلہ میں رقمطراز ہیں:

"معلوم ہونا چاہیے کہ رکوع میں جاتے اور اس سے اٹھتے وقت ہاتھوں کو اٹھانے کے متعلق جو صحیح حدیثیں وارد ہیں ان میں سے اکثر حضرت ابن عمرؓ کے واسطے سے مروی ہیں لیکن ہاتھ نہ اٹھانے کے بارے میں بھی صحیح حدیثیں بیان کی گئی ہیں، شیخ نورالحق اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کی اس روایت کو پیش کرتے ہیں جو انھوں نے اپنے شیوخ سے بیان کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول بتایا ہے کہ آپؐ صرف نماز شروع کرتے وقت دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے، اس کے سوا کسی اور موقع پر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، امام طحاویؒ

صحیح سندوں سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ صرف نماز کی ابتدا میں دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے
امام ترمذی نے اپنی جامع میں اس مسئلہ کے متعلق دو ابواب قائم کیے ہیں، ایک میں امام بخاریؒ کی طرح حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی روایت نقل کی ہے اور کہا ہے کہ کبار صحابہ کی ایک بڑی جماعت اسی کی قائل ہے، دوسرے باب میں یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ افتتاح کے علاوہ کسی اور موقع پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے، اس باب میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت تحریر کی ہے، جس میں صرف افتتاح کے وقت دونوں ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے، امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ اس کے قائل بھی علمائے صحابہ و تابعین کی بڑی جماعت ہے، اور سفیان ثوری اور اہل کوفہ یعنی حنفیہ کا یہی مذہب ہے، جامع الاصول میں ابن مسعودؓ کی حدیث ابو داؤد اور نسائی کے حوالہ سے منقول ہے، اور براءؓ بن عازب کی حدیث امام ابو داؤد مرفوعاً لائے ہیں، صحیح روایتوں سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے بھی یہی منقول ہے کہ وہ نماز کے شروع میں رفع یدین کرتے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ احادیث و آثار صحیحہ دونوں جانب موجود ہیں، علمائے حنفیہ جو عدم رفع کے قائل ہیں یہ کہتے ہیں کہ رفع والی حدیث منسوخ ہو گئی ہے، خود اس کے راوی حضرت ابن عمرؓ کو اس کے برخلاف کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے، اور منسوخ حدیث کی روایت کرنا ممنوع نہیں ہے، پس جب راوی ہی اپنی روایت کے خلاف عمل کر رہا ہو تو ایسی حدیث کو حجت قرار دینا مناسب نہیں ہے، یہ ایک طے شدہ اصول ہے، ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ مجھ سے اتنی بڑی جماعت نے بیان کیا ہے جس کے ناموں کو شمار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے عبداللہ ابن عمرؓ کو دیکھا کہ وہ صرف نماز کی ابتدا ہی میں اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے تھے، امام طحاویؒ نے مشکل الآثار میں مجاہد سے بیان کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ کے پیچھے

نماز ادا کی، وہ صرف تکبیر اولیٰ میں ہاتھ اٹھاتے تھے، نہایہ شرح ہدایہ میں ہے کہ عبداللہ ابن زبیر نے مسجد حرام میں ایک شخص کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ وہ رکوع میں جاتے اور اس سے اٹھتے ہوئے رفع یدین کر رہا ہے، جب وہ نماز سے فارغ ہو گیا تو انھوں نے اس سے کہا کہ ایسا نہ کرو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پہلے کیا تھا مگر بعد میں ترک کر دیا تھا، مجاہد کہتے ہیں کہ میں بیس برس تک حضرت ابن عمرؓ کی خدمت میں رہا لیکن میں نے انھیں تکبیر اولیٰ کے سوا نماز میں کسی موقع پر ہاتھوں کو اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا
شیخ نور الحق ان سب اقوال و توجیہات کو بیان کرنے کے بعد جو کچھ تحریر فرماتے ہیں اس سے ان کی بے تعصبی اور حق پسندی ظاہر ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

"ان تمام آثار و اعمال میں صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت سے نسخ کا جو قول منقول ہے، وہ اشکال سے خالی نہیں، اس باب میں اس سے زیادہ آسان تر بات اور کوئی نہیں ہے کہ رفع (ہاتھ اٹھانے) اور عدم رفع (ہاتھ نہ اٹھانے) دونوں کی سنیت کا قائل ہونا چاہیے، واللہ اعلم۔ یہ بحث فتح المنان فی تائید مذہب النعمان سے منقول ہے، جس میں شیخ المحدثین عبدالحقؒ نے شرح و بسط سے گفتگو کی ہے۔
شافعیہ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ رکوع میں جاتے ہوئے اور اس سے سر اٹھاتے ہوئے رفع یدین کرنا چاہیے، یہ لوگ تشہد سے اٹھتے وقت رفع یدین کے قائل نہیں ہیں، اور یہ حدیث جسے امام بخاریؒ باب کے آخر میں لائے ہیں اس کے موافق بہت سی صحیح حدیثیں حضرت ابن عمرؓ اور دوسرے حضرات سے مروی ہیں، اسی بنا پر بعض شوافع اس کو بھی سنت سمجھتے ہیں لیکن یہ امام شافعیؒ سے منقول نہیں ہے، ان کی وصیت یہ تھی کہ اگر میرے فیصلے کے خلاف کوئی حدیث موجود ہو تو میرے قول کو چھوڑ کر اسی حدیث پر عمل کرو، اکثر شافعیہ کے برخلاف امام نوویؒ نے اس کی سنیت کو صحیح قرار دیا ہے۔ (ج ۱، ص ۲۵۴ و ۲۵۵)۔

(باقی)

علی بن ربّن الطبری کی فردوس الحکمۃ میں آیوروید پر ایک مقالہ

از
پروفیسر محمد صابر خان، سابق ممبر پبلک سروس کمیشن کلکتہ

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام ہی دنیا کا ایسا مذہب ہے جو انسانی سماج کی فلاح وبہبود کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے، اس لیے مسلمانوں نے اپنی تاریخ کی ابتدا ہی سے علم طب سے بہت دلچسپی لی کیونکہ اس سے خدمت خلق میں بہت مدد ملتی ہے۔ اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے انھوں نے بقراط اور جالینوس کی بہت سی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا جن میں سے اکثر وبیشتر آج بھی موجود ہیں، بہت سے عرب حکماء نے خود بھی بہت سی کتابیں لکھیں۔ فن طب کے ابتدائی دور میں لکھی ہوئی کتابوں میں سے ایک کتاب "فردوس الحکمۃ فی الطب" بھی ہے جسے ابوالحسن علی بن سہل ربن الطبری نے لکھی تھی، اس کتاب کے بارے میں کچھ لکھنے یا اس میں درج مقالہ آیوروید پر تبصرہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصنف اور اس زمانہ کے حالات کا ایک مختصر جائزہ لیا جائے،

حالات زندگی اور تصنیفات الطبری کی پیدائش کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، لیکن یہ ممکن ہے کہ وہ مرو، خراسان میں تقریباً ۱۹۵/۸۱۰ میں پیدا ہوئے ہوں جبکہ عباسیوں کا زوال

شروع ہو چکا تھا۔ البیہقی نے لکھا ہے کہ ان کے والد سہل ایک شامی عیسائی تھے جو مرو میں کاتب کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور جن کا مطالعہ بائبل، فلسفہ، علم النجوم اور علم طب پر کافی وسیع تھا۔ الطبری اپنے والد کے ساتھ طبرستان میں رہتے تھے اور انھوں نے ان سے علم طب، فلسفہ اور علم ریاضی سیکھا تھا اور بائبل پڑھی تھی۔ فارسی ان کی مادری زبان تھی لیکن انھوں نے اپنے والد سے عربی، سریانی اور عبرانی زبانیں بھی سیکھیں۔ سب سے پہلے انھوں نے طبرستان کے حاکم مازیار بن قارن کے کاتب کی حیثیت سے ۲۱۴/۸۳۰ میں ملازمت شروع کی۔ جب خلیفہ معتصم نے سنہ ۲۲۴ (۸۳۸) میں مازیار کو قتل کر دیا تو الطبری بغداد چلے آئے اور انھوں نے خلیفہ المتوکل کی ملازمت کی اور اسی زمانے میں وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور عیسائی اور یہود کے حملوں سے اسلام کا دفاع کیا۔ جس کا ثبوت ان کی مختصر لیکن جامع کتاب "الدین والدولۃ" ہے۔

اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اصل میں عیسائی تھے یا یہودی کیونکہ ان کی کتاب "الدین والدولۃ" کے تجزیہ اور موجودہ تحقیق سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ پیدائش کے وقت شامی عیسائی تھے۔

ان کی وفات کی اصل تاریخ کے بارے میں بھی اختلاف ہے لیکن موجودہ تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا انتقال ۲۵۰/۸۶۴ میں ہوا لہذا یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے کہ مشہور طبیب ابوبکر محمد بن زکریا الرازی جن کی پیدائش ۲۵۰/۸۶۴ میں ہوئی تھی ان کے تلامذہ میں سے تھے

ان کی تصانیف میں سے صرف ۱۴ کتابوں کے نام ہم تک پہنچے ہیں لیکن ان میں

سے صرف تین فردوس الحکمۃ، کتاب الدین والدولۃ اور کتاب
حفظ الصحۃ المحفوظۃ کے علاوہ سب ناپید معلوم ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے
کہ ان کی سب سے اہم کتاب "فردوس الحکمۃ" ہی ہے جو زمانہ کے دستبرد سے
بچ گئی ہے۔

"فردوس الحکمۃ" کے ماخذ اس کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ الطبری
یونانی، ہندی اور عرب اطباء کی تصنیفات سے آگاہ تھے خاص طور سے انھوں نے
بقراط، جالینوس، ارسطو، دیوسقوریدس، ماسرجویہ اور یوحنا بن ماسویہ کی
کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ مشہور عرب طبیب اور مترجم حنین بن اسحاق کے شاگرد
تھے اور ان کی کتابوں سے بھی استفادہ کیا تھا۔ اسی طرح اس مقالے میں جس میں
انھوں نے آیوروید طریقۂ علاج سے بحث کی ہے اس کی چار اہم کتابوں کا ذکر کیا ہے
جو یہ ہیں، چرک سمھتا، شسرتا سمھتا، مادھیکرا کی ندانا اور بھاگ بٹا کی اسٹنگ ہتریا۔
ان سے انھوں نے استفادہ کیا تھا۔ دراصل اس مقالے میں انھوں نے اول تین
کتابوں کا ذکر دو دو بار کیا ہے اور آخر الذکر کا صرف ایک بار، ایک جگہ انھوں نے
ایک ہندی خاتون کی ایک طبی کتاب کا ذکر کیا ہے لیکن ان کا نام اور کتاب کا نام
نہیں لکھا، دوسرے ماخذ مثلاً ابن الندیم اور ابن ابی اصیبعۃ کی کتابوں میں ان کا
نام روسا الہندیہ ملتا ہے، جو نسوانی امراض کی ماہر تھیں لیکن ان کی کتاب کا نام
موجودہ ماخذ سے معلوم نہیں ہوتا، حال کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ آیوروید کی مندرجہ
بالا چار کتابوں میں سے تین کے ترجمے سنسکرت سے عربی میں ہو چکے تھے، ابن الندیم
نے ان بارہ ہندو ویدوں کا ذکر کیا ہے جو بغداد میں تھے اور ان کی کتابوں کے نام

لکھے ہیں جن کا عربی ترجمہ ہو چکا تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ ششرتا کی کتاب ششرت
دس مقالوں پر مشتمل تھی۔ جس کا ترجمہ منکا وید نے یحییٰ بن خالد برمکی کے حکم سے کیا تھا
بغداد کے بیمارستان کے ناظم اعلیٰ ابن دھن نے بھاگ بٹا کی اسٹنگ ہردیا کا
عربی ترجمہ کیا۔ جسے استنکر کا نام دیا گیا تھا۔ اس نے مزید لکھا ہے کہ چرک سمھتا
کا ترجمہ شرک عبداللہ بن علی نے پہلے سنسکرت سے فارسی میں پھر فارسی سے
عربی میں کیا تھا۔ لیکن ندان کے بارے میں یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا
ترجمہ عربی میں کس نے کیا تھا۔ اصل کتاب میں بھی الطبری، مصری، کلدانی اور
ہندوستانی اطباء و حکماء کی طبی آراؤں کو نقل کرتے ہیں لیکن ان کی کتابوں کا ذکر
نہیں کرتے۔

ابن الندیم اور ابن ابی اصیبعہ دونوں مصنف ان کی پانچ کتابوں کا ذکر
کرتے ہیں، ابن اسفندیار نے تاریخ طبرستان میں ان کی ایک اور کتاب کا نام
ہمیں بتایا ہے، ان کے علاوہ اور کتابوں میں ان کی مزید تین کتابوں کے نام ملتے ہیں
اس طرح ان کی چودہ کتابوں کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔ جن میں فردوس الحکمۃ کا سریانی
ترجمہ بھی شامل ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کی ان کتابوں میں سے صرف
تین ہم تک پہنچی ہیں اور یہ ممکن ہے کہ ان کی دوسری کتابیں ضائع ہو گئی ہوں بہرحال
دنیائے علم کے لیے عام طور سے اور یونانی طب کے لیے خاص طور سے یہ ایک
نیک فال ہے کہ ان کی سب سے اہم کتاب فردوس الحکمۃ فی الطب ہم تک پہنچی ہے
جس کے مکمل حالت میں پانچ سے بھی زیادہ مخطوطات موجود ہیں۔ یہ عربی۔ یونانی طب
کے ابتدائی زمانہ کی ایک اہم جامع اور مکمل کتاب ہے جو موجود ہے اور جس میں اس

طب کے تمام اہم گوشوں سے بحث کی گئی ہے۔

ان کی دو اور موجودہ کتابوں میں سے ایک تو کتاب الدین والدولۃ ہے جس کا متن انگریزی ترجمہ کے ساتھ شایع ہو چکا ہے اور دوسری کتاب حفظ الصحۃ المحفوظہ ہے جس کا ایک مخطوطہ آکسفورڈ کی بوڈلین لائبریری میں محفوظ ہے۔ میں قارئین کی توجہ اس مخطوطہ کی طرف مبذول کراتا ہوں۔

فردوس الحکمۃ کے مخطوطے کہاں کہاں ہیں، برٹش میوزیم لندن، اسٹاڈس بیلیوتھک، برلن گوتھا لائبریری، رضا لائبریری رامپور میں اس کے چار مخطوطے ہیں اور ایک مخطوطہ لکھنؤ کے حکیم خواجہ کمال الدین کے ذاتی کتب خانے میں تھا۔ لیکن معلوم نہیں وہ آج کل کہاں ہے۔ ان پانچوں مخطوطات پر مبنی اس کا ایک مکمل متن ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی صاحب نے کیمبرج میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کیلئے ایڈٹ کیا تھا۔ پروفیسر ای۔ جی براؤن مشہور مورخ طب عربی کی نگرانی میں یہ اہم کام انھوں نے انجام دیا تھا۔ اس کے بعد یہ متن برلن کے زون پریس سے ۱۹۲۸ عیسوی میں شایع ہوا تھا۔ اس میں عربی میں ایک مقدمہ اور انگریزی میں ایک پیش لفظ موجود ہیں، جو اس کتاب کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرتے ہیں۔ عام طور سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ متن عیوب و اسقام سے پاک ہے۔ اس کے مزید دو تین مکمل مخطوطات کے تقابلی مطالعہ کے بعد ہی اس پر مفصل تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ فردوس الحکمۃ کے تین حصوں کا اردو ترجمہ حکیم رشید اشرف ندوی نے کیا ہے اور ہمدرد فاونڈیشن کراچی پاکستان نے اس کو

شایع کیا ہے[1]، جیسا کہ فردوس الحکمۃ کے ایڈیٹر ڈاکٹر صدیقی نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے۔ پروفیسر ای جی براؤن نے اس کے بعض حصوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ لیکن شاید وہ اب تک شایع نہیں ہوا۔

اس وقت جبکہ الطبری نے فردوس الحکمۃ لکھی تھی۔ طب فلسفے کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا اور ایک حکیم کے لیے فلسفی ہونا بھی ضروری تھا۔ فلسفے میں بہت سے علوم جیسے علم النباتات، علم الحیوانات، علم الطبیعیات، ریاضیات اور علم الہیئۃ بھی شامل تھے۔ لہذا ان علوم کے بارے میں بھی کافی معلومات اس کتاب میں موجود ہیں۔ اسی وجہ سے اس کتاب کے ماخذ مختلف اور متنوع ہیں۔ لیکن عام طور پر یونانی ہیں۔ متن کے مقدمے میں جیسا کہ لکھا گیا ہے یہ ماخذ بقراط، جالینوس، دیوسقوریڈس، فیثاغورس، افلاطون، ارسطو، بطلیموس، اسطفن، مغنس وغیرہ کی تصنیفات ہیں، عرب اطباء میں سے الطبری نے یوحنا بن ماسویہ (م ۸۵۷ عیسوی) ماسرجویہ اور حنین بن اسحاق کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ دو کتابیں جن سے بہت زیادہ استفادہ کیا گیا ہے بقراط کی (APHORISM اور PROGNOSTICS) کے عربی ترجمے ہیں۔

اس کتاب کے ایڈیٹر نے مندرجہ بالا مصنفین کی دس کتابوں کے نام گنائے ہیں جن سے الطبری نے استفادہ کیا تھا۔ اگرچہ الطبری کی عادت ہے کہ وہ عام طور سے اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کرتے، کبھی تو وہ صرف مصنف کا نام اور کبھی صرف

[1] میں جناب حاجی حکیم محمد سعید صاحب ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن، کراچی، پاکستان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے اس کتاب کی ایک جلد مجھے بھیجی ہے۔

کتاب کا نام لکھ دیتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے مآخذ یونانی اور عربی اطباء کی بہترین اور نہایت قابل اعتبار تصانیف ہیں جن سے اس کتاب کی اہمیت اور قیمت بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ کبھی تو وہ قدیم کلدانی اور مصری اطباء کی طبی رایوں کو بھی نقل کرتے ہیں۔ لیکن نہ تو وہ ان اطباء کے نام لکھتے ہیں اور نہ ان کی کتابوں کے نام سے قاری کو آگاہ کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب کا درجہ ابتدائی دور کی طبی کتابوں میں بہت بلند ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ یہ ایک اہم اور جامع کتاب ہے اور بعد کے آنے والے اطباء نے اس کا تتبع کیا ہے۔ یہ کتاب علم طب کے مختلف گوشوں کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔ یعنی عرب یونانی طب وہ طریقہ علاج ہے جسے Arab Medicine یا Islamic Medicine بھی کہتے ہیں۔ اس کتاب کے ایڈیٹر نے اس کی اہمیت اور افادیت پر سیر حاصل بحث اپنے مقدمے میں کی ہے اس لیے ان کے بارے میں اب مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی البتہ اتنا لکھنا کافی ہوگا کہ اس کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر بعد کے اطباء نے اس سے استفادہ کیا ہے اور یہ کتاب بعد میں لکھی جانے والی طب کی کتابوں کا مآخذ رہی ہے مثلاً ابوبکر محمد بن زکریا الرازی نے الحاوی میں اور ابوعلی ابن سینا نے القانون فی الطب میں فردوس الحکمۃ سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ البیرونی بھی اپنی کتابوں میں اس کے حوالے دیتا ہے۔ کرمانی نے اپنی کتاب شرح الاسباب والعلامات میں بھی اس کے حوالے دیئے ہیں مشہور مورخ محمد بن جریر الطبری، یاقوت الحموی، ابن القفطی اور دوسرے مصنفین نے بھی اس کتاب کی بیحد تعریف کی ہے۔

خلیفہ محمد بلّو کی تاریخی و علمی شخصیت

(فُلانی سلطنت کا دوسرا عظیم فرماں روا)

ڈاکٹر سید احتشام ندوی پروفیسر و صدر شعبہ عربی کالی کٹ یونیورسٹی۔ کیرلا

نائیجیریا میں فلانی سلطنت کے موسس عثمان بن فودی نے اسلامی قوانین نافذ کیے اور اپنی حکومت کو خلافت کے نام سے موسوم کیا[1] ان کے صاحبزادے محمد بلو ان کے بعد خلیفہ ہوئے۔ انھوں نے حکومت کو مستحکم کیا۔ سنت کا احیا اور بدعات کا قلع قمع کرنے کے علاوہ انھوں نے نائیجیریا کی تاریخ پر کئی کتابیں عربی زبان میں لکھیں۔ وہ ایک کامیاب حکمراں اور ایک ممتاز مصنف تھے۔

شیخ محمد بلو کی شخصیت خود ان کے والد کے زمانہ میں نمایاں ہو گئی تھی حتیٰ کہ سلطان گوبر کے پایۂ تخت الکاؤلاوا (ALKAWLAWA) کو شیخ محمد بلو نے فتح کیا جس کے باعث سارے ہاؤسا حکمراں ہمت ہار بیٹھے اس لیے کہ گوبر سب سے بڑی ہاؤسا سلطنت تھی۔ یہی وہ نقطۂ تغیر ہے جہاں سے ہاؤسا حکومتیں ایک ایک کر کے ختم ہو گئیں اور شیخ عثمان کی اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ اسلام کے

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "نائیجیریا میں تحریک جہاد و نصب خلافت" معارف مارچ سنہ ۱۹۸۸ء

اس قائد اور مدبر نے اپنی نئی حکومت کی جڑیں اس قدر مستحکم کر دی تھیں کہ ۱۰۰ برس تک
وہ پوری آن بان سے قائم رہی۔

نئے شہر کی تعمیر

خلیفہ محمد بلو نے سب سے اہم تعمیری کام یہ انجام دیا کہ ۱۸۰۹ء میں
انھوں نے اپنے قدیم وطن ڈیگل سے تقریباً ۲۰ میل دور دریائے سکوٹو کے کنارے
ایک نیا شہر آباد کیا جو آج نائیجیریا کے صوبہ سکوٹو کا پایۂ تخت ہے۔ یہ کارنامہ
سلطان محمد بلو کے تعمیری منصوبوں کا ایک عمدہ نمونہ ہے جس پر کوئی بھی قوم فخر
کر سکتی ہے۔ اس نئی حکومت اور نئے پایۂ تخت کی طرف لوگ آکر بسنے لگے ان آنے
والوں میں فلانی بوزوز (BUZOS) اور عرب سب شامل تھے سلطان بلو
نے سب کا سرگرمی سے خیر مقدم کیا۔ کلاپرٹن (CLAPPERTON) ایک
انگریز سیاح لکھتا ہے کہ جس زمانہ میں اس نے سکوٹو شہر دیکھا تھا اور خود سلطان
سے ملاقات کی تھی اس وقت وہ کانو شہر سے بڑا تھا اور اس کی آبادی اندازاً ایک لاکھ
۲۰ ہزار تھی۔ شہر پناہ کی دیواریں سات سے دس میٹر تک بلند تھیں۔ شہر کے اندر
آنے کے لیے ۱۲ دروازے تھے جو سورج غروب ہوتے ہی بند کر دیئے جاتے
تھے۔ شہر میں عمدہ سڑکیں، دو مسجدیں (غالباً جامع مساجد) تھیں اور وسیع بازار
تھا[1]۔ اس مرد مجاہد نے ایک اور شہر آباد کیا "ورنو" اسی شہر میں انکا انتقال ہوا
اور یہیں ان کا مقبرہ بھی ہے۔

محمد بلو نے ایک عظیم حکمراں کی حیثیت سے اپنی نمایاں صلاحیتوں کا اظہار
کیا انھوں نے پورے ملک کو متحد کیا اور اس کو منظم کرکے دشمنوں کا قلع قمع کر دیا۔

---

[1] عثمان بن فودی از شیہو شگاری ص ۴۳ تا ۴۶

عبداللہ بن فودی اور محمد بلو

اس موقع پر عبداللہ بن فودی کا ذکر ضروری ہے وہ ایک
زبردست عالم، شاعر اور صاحب نظر سیاست داں تھے
انھوں نے شاہ گوبر کو پہلی بار شکست دی تھی اس کے علاوہ بھی متعدد معرکے
سر کیے تھے وہ محمد بلو سے عمر، علم اور تجربہ سب میں فائق تھے جب شیخ عثمان بن
فودی کی بیماری کی خبر پھیل گئی تو شیخ عبداللہ بن فودی ان کو دیکھنے آئے مگر محمد بلو
نے حکم دے دیا کہ شہر کے دروازے بند کر دیئے جائیں۔ اس موقع پر وزیر
عبداللہ بن فودی نے نہایت دانشمندی سے کام لیا اور سکوٹو شہر کے دروازے
بند پاکر واپس چلے گئے مگر واپسی پر بغیر کسی سبب کے ایک گاؤں کلمبینا
KALAMBAINA میں طن بیوی کیبوی نے بغاوت کر دی۔ بہرحال اس پر
چڑھائی کے لیے شیخ عبداللہ بن فودی نے ایک لشکر تیار کیا ان کی کمک کو خود امیر المومنین
محمد بلو ایک جرار لشکر لے کر میدان جنگ میں پہنچ گئے۔ دونوں نے مل کر باغی
کا قلع قمع کر دیا۔ فتح کے بعد دونوں نے ایک دوسرے سے ملاقات کی۔ مگر
اب معاملہ یہ تھا کہ محمد بلو نے شیخ عبداللہ بن فودی کے مشورہ کے بغیر اپنے
آپ کو اپنے والد کے جانشین اور امیر المومنین ہونے کا اعلان کر دیا اور
ان کو پایۂ تخت میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ مگر دوسری طرف چچا
ان کی مدد کے لیے فوج لے کر پہنچ گئے۔ اس موقع پر اگر ذرا بھی دونوں میں طاقت
آزمائی یا شیخ عبداللہ کو خلافت کی خواہش ہوتی تو دوسرا معرکہ خود ان میں آپس
میں شروع ہو جاتا مگر چچا اور بھتیجے کی ملاقات کا منظر بڑا دلکش رہا۔ بھتیجے محمد بلو
نے کوشش کی کہ وہ گھوڑے سے زمین پر اتر کر چچا کا استقبال کریں۔ مگر چچا

عبداللہ بن فودی نے یہ محسوس کر کے کہ ان کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا کہ وہ گھوڑے پر ٹھہرے رہیں پھر عبداللہ نے سامنے آکر اس طرح ان کو سلام کیا جیسا کہ خلیفہ کو سلام کیا جاتا ہے دوسرے الفاظ میں انھوں نے اپنے بھتیجے کو خلیفہ اور امیر المومنین تسلیم کر لیا۔ یہ واضح رہے کہ خلیفہ شیخ عثمان بن فودی نے عبداللہ کو پہلے ہی مشرقی حصہ کا حاکم مطلق بنا دیا تھا اور مغربی حصہ کا حاکم اپنے بیٹے کو بنایا تھا۔ یہاں محض شیخ عبداللہ بن فودی کی وسعت نظر سے باہمی طاقت کی رسہ کشی ختم ہوگئی بالکل اسی طرز کی تقسیم ہارون الرشید نے امین اور مامون کے درمیان کی تھی۔ مامون کو خراسان کا حاکم مطلق بنا دیا تھا اور امین کو باقی تمام ملک عطا کر دیا تھا مگر دونوں نے جنگ کر کے خون خرابہ کیا لیکن یہاں عبداللہ بن فودی نے اپنے بھتیجے کی حکومت تسلیم کر کے خانہ جنگی سے اجتناب کیا۔

شیخ عثمان بن فودی کے انتقال کے بعد ہاؤسا کے قدیم حکمرانوں کو خیال پیدا ہوا کہ اب اپنی سلطنتوں کی بازیابی کے لیے موقع مناسب ہے لہذا زنفرا اور گوبر کے صوبوں میں بغاوتیں ہوئیں جن کو نئے خلیفہ نے پوری قوت سے کچل دیا اور شہر "القاضاوا" کو تو اس طرح برباد کر دیا کہ اس میں کوئی شخص باقی نہ رہا۔ ۱۸۲۶ء میں امین کانمی نے خلیفہ محمد بلو پر ایک بڑے لشکر کے ساتھ حملہ کر دیا مگر سپہ سالار یوبشی یعقوب نے ان کو شکست دے کر ان کے لشکر کو پارہ پارہ کر دیا۔ اسی سال انگریز سیاح کلاپرٹن دوسری بار سکوتو پہونچا اور خلیفہ محمد بلو سے ملاقات کی۔[1] اس نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ خلیفہ محمد بلو ایک

۱؎ الثقافۃ العربیۃ فی نیجیریا از ڈاکٹر علی ابوبکر طبع اول ص ۱۲۱، ۱۲۲۔

بڑے عالم تھے انھوں نے کلاپرٹن سے گفتگو کے دوران علم النجوم، مذہبیات، طب، علم الحساب، تجارت، برطانیہ کا ہندوستان کو فتح کرنا، الجزائر میں مسلمانوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جنگ، اسپین میں موریش تمدن اور علم کے دوسرے میدانوں میں خلیفہ محمد بلو نے اپنی وسیع معلومات کا اظہار کیا[1] اور انھوں نے دریائے نائیجر کا نقشہ کلاپرٹن کے سامنے بڑی دقت نظر اور صحت کے ساتھ کھینچ کر اس کو دکھایا۔[2]

حلیہ خلیفہ بلو کا قد اوسط سے ذرا نکلتا ہوا تھا جسم گٹھا اور مضبوط تھا۔ دیکھنے میں قبول صورت تھے۔ عمدہ پیشانی اور ستواں ناک تھی۔ منہ کا دھانہ چھوٹا اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ جب کلاپرٹن ان سے ۱۸۲۴ء میں ملا تو اس وقت وہ آسمانی رنگ کی عبا زیب تن کیے ہوئے تھے جو سوتی تھی۔ اس عبا کا ایک حصہ ان کی ناک پر تھا جو تورج فیشن TUAREGE FASHION کا مظہر تھا۔[3] جب کلاپرٹن نے دوبارہ ۱۸۲۶ء میں ان سے ملاقات کی تو اس دن ان کی خدمت میں تمام گورنر حاضر تھے سوا اڈاماوا (ADAMAWA) کے۔ یہ تمام گورنر خلیفہ سے بہتر اور عمدہ لباس میں ملبوس تھے۔[4]

۱؎ عثمان ڈان فوڈیو (انگریزی) از شیہو شگاری ص ۴۸ ۲؎ الثقافۃ الاسلامیہ ص ۱۲۲۔ یہ واضح رہے کہ خلیفہ نے پہلی ملاقات میں کلاپرٹن سے یہ گفتگو کی تھی مگر دوسری ملاقات میں انھوں نے اس سے بے رخی ظاہر کی شاید ان کو اس کی جاسوسی کا اندازہ ہو گیا تھا (مؤلف)

۳؎ نائیجریا میں اہم لوگ عمامہ کے دامن سے منہ اور ناک بند رکھتے ہیں اب بھی یہ رسم قائم ہے۔

۴؎ ایضاً ص ۴۸۔

دینداری اور سادگی

خلیفہ اسلامی شعائر کا احترام کرتے تھے اور عبادات کے پابند تھے۔ رمضان میں افطار کے بعد دو گھنٹے مسجد میں صرف کرتے تھے ۔ وہ عوام کو اتباع سنت کی ترغیب دیتے تھے انھوں نے ہر شہر اور قصبہ میں ایک مسجد بنوائی اور قدیم مسجدوں کی جگہ نئی مسجد تعمیر کی ۔

خود ان کی اصل رہائش گاہ نہایت سادہ تھی۔ چار دیواری کے اندر بہت سی جھونپڑیاں تھیں۔ پانچ گنبد والی عمارتیں اور ایک چھوٹی مسجد تھی۔ خلیفہ کے اپنے ہاتھ کا لگایا ہوا ایک باغ تھا۔ ایک حصہ میں وہ لوگوں سے ملاقات کرتے تھے اور وہیں ان کی شکایات بھی سنتے تھے۔[1]

بلو کی ایک خادمہ کا کام یہ تھا کہ وہ رات کو سرکاری کاغذات دیکھیں تو یہ سرکاری تیل والا چراغ پیش کرے اور جب خلیفہ اپنا ذاتی کام کریں تو اس کو بجھا دے اور ان کا ذاتی چراغ جلا کر پیش کرے ۔ اس طرح انھوں نے خلفائے راشدین رض اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رح کی زندگی کو نمونہ بنانے کی کوشش کی۔

خلیفہ محمد بلو نے ایک اور عمدہ مثال یہ پیش کی کہ وہ تحفے بالکل قبول نہ کرتے تھے۔ مرافا (MARAFA) کے حاکم نے خلیفہ کے ایلچی زیتارو ZITARO کو خلیفہ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے بہت سے تحفے دیئے مگر انھوں نے ان کو واپس کر دیا اور ایلچی سے کہا "اس برائی میں مبتلا نہ ہو اور حاکم مرافا سے کہو کہ یہ تحفے غیر قانونی ہیں لہذا یہ قبول نہیں کیے جا سکتے۔"[2]

---

[1] ایضاً ص ۴۸ [2] ایضاً ص ۵۰ ۔

خلیفہ کا وزیر اعظم ابن لیما

خلیفہ محمد بلو کے دور میں وزارت کے عہدہ پر گیداڈو بن لیما فائز تھے، یہ ایک بڑے عالم دین اور عربی زبان کے ادیب تھے جو شیخ عثمان بن فودی کے زمانہ میں جہاد میں شریک رہتے تھے۔ جب محمد بلو خلیفہ ہوئے تو انھوں نے ابن لیما کو وزیر اعظم بنایا۔ وہ عربی زبان پر مکمل قدرت رکھتے تھے۔ نہایت با اخلاق اور لائق حکمراں تھے انھوں نے پورے ملک پر اچھی طرح کنٹرول کیا۔ وہ عمدہ مقرر بھی تھے اور شیخ عثمان بن فودی کے تبلیغی مشن کے علمبردار تھے ۔ سکریٹری کا کام ان کے ذمہ تھا۔ وہ میدان جنگ میں ایک بہادر سپہ سالار تھے۔ ان کے مختلف فرائض میں ایک فرض یہ تھا کہ وہ سکوٹو کی شہر پناہ کی دیکھ بھال کریں۔ دیواروں کی مرمت کرائیں۔ دروازوں اور مسجدوں کی اصلاح کرائیں اور زائرین کا استقبال کریں۔

شیخ عثمان کی وفات کے بعد نانا اسمار کی معاونت سے ابن لیما نے ان کی لائبریری کی نئی تنظیم کی اور کتابوں کو از سر نو جمع کر کے انہیں محفوظ کر دیا۔[1]

مشیران دولت

خلیفہ محمد بلو نے آزمودہ کاروں، مخلصوں اور مجاہدوں کو اپنا مشیر بنایا ان کے بعض مشیر سلطنت گوبر میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے جو بعد میں شیخ عثمان بن فودی کے ساتھ ہو گئے۔ خلیفہ محمد بلو نے ان کو اپنی حکومت میں اعلیٰ مناصب عطا کیے اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھایا۔ ان مشیروں میں گلاڈیمو ڈوشیرو GALADIMO DUSHIRO شامل تھے جو پہلے گوبر کی سلطنت میں بھی مشیر کار تھے مگر سنہ ۱۸۱۸ء میں شیخ عثمان سے آکر مل گئے۔

---

[1] عثمان بن فودی از شیخو شگاری ص ۵۱ ۔

دوسرے اہم مشیر خلیفہ ابوبکر بن جادا تھے یہ خلیفہ محمد بلو کے بھتیجے (ABA) ابن ڈاموحمد (NDAMU MOHD)، عمروالکلام کے صاحبزادے موڈیگل (MUDEGEL) اور شیخ عثمان کے سپہ سالار جنگ علیوجیڈو (ALIYU JEDU) یہ سب خود شیخ عثمان کے دور کے آزمودہ کار اور شریک جہاد بزرگ تھے جو خلیفہ محمد بلو کے گرد ہالہ کے مانند تھے اور ان کو صحیح مشوروں سے نوازتے تھے۔

ملک کا نظم ونسق اور شرعی قوانین کا نفاذ

خلیفہ بلو نے قرآن مجید کے قوانین کو نافذ کیا انگریز سیاح کلاپرٹن (CLAPPERTON) جو دوبارہ ۱۸۲۶ء میں سکوتو آیا وہیں بیمار پڑا اور مرگیا اور سکوتو سے چند میل کے فاصلہ پر دفن کردیا گیا۔ یہی سیاح رقمطراز ہے کہ اس ملک میں قرآن مجید کے قوانین پوری سختی سے نافذ ہیں اور امن کا یہ عالم ہے کہ حالت جنگ نہ ہو تو عام طور پر مشہور ہے کہ اگر ایک عورت ایک ٹوکری میں سونا بھر کر سر پر رکھے اور تنہا اس فلانی حکومت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جائے تو کوئی شخص اس سے تعرض نہ کرے گا۔[1]

خلیفہ محمد بلو معاف کرنے میں نہایت فراخدل تھے مگر جو لوگ واقعی مجرم اور قانون شکن ہوتے تھے ان پر اگر غصہ ہو جاتے تو پھر معاف نہیں کرتے تھے۔ ایسے موقع پر ان کو راضی نہیں کیا جاسکتا تھا۔[2]

خلیفہ محمد بلو کے قاضی القضاۃ مالم مصطفےٰ تھے ان کے علاوہ دوسرے

---

[1] سفرنامہ کلاپرٹن ج ۲ ص ۲۰۷ [2] عثمان بن فودی ص ۵۲۔

قاضی بھی تھے جو مقدمات کو جلد نپٹانے کی کوشش کرتے تھے مارکٹ ایک جج میکو (MIKO) کی نگرانی میں تھا۔ اس قاضی کی ذمہ داری یہ تھی کہ غلہ کی تول صحیح ہو (یہاں آج بھی قدیم طریقہ کے مطابق غلہ تول کر نہیں بکتا بلکہ "باول" (ایک پیمانہ) میں بھر بھر کر چاول اور آٹا وغیرہ فروخت ہوتا ہے) یہی جج اسکی بھی نگرانی کرتا تھا کہ کسی چیز میں ملاوٹ نہ ہو اور دودھ میں پانی ملا کر نہ فروخت کیا جائے۔

محکمۂ پولیس کا خاص افسر بینگو BANGO تھا یہ شخص پہلے ہاؤسا حکومت کے دور میں بھی ریاست گوبر میں اسی عہدہ پر فائز تھا۔ خلیفہ نے اس کو وہی عہدہ عطا کیا۔ خلیفہ نے محکمۂ جاسوسی میں بھی گذشتہ عہد کے تجربہ کار اور لائق لوگوں کو اس محکمہ میں باقی رکھا۔[1]

اس دور میں یہ عام دستور تھا کہ ہر خاندان خود کفیل ہو اور اپنا غلہ خود پیدا کرے۔ زمین اس ملک میں بہت ہے۔ شہر سکوتو کے باہر جو بڑے بڑے فارم تھے ان میں غلہ اگانے اور زراعت کرنے کا کام قیدیوں کے ذمہ تھا جو محنت کرکے غلہ پیدا کرتے اس میں سے بقدر ضرورت غلہ انہیں بھی دے دیا جاتا تھا۔ قیدیوں کے ساتھ عمدہ سلوک کیا جاتا تھا۔[2]

خلیفہ بلو نے خود اپنے گھر متصل ایک فارم بنایا تھا جس کی آبپاشی کا کام بھی وہی کرتے تھے۔ وہ جس طرح خود سرگرم عمل اور متحرک تھے اسی طرح دوسروں کو بھی مستعد اور کارگذار دیکھنا چاہتے تھے اس لیے بیکار کاہل اور ناکارہ لوگوں کو

---

[1] عثمان بن فودی ص ۵۲ [2] ایضاً ص ۵۳۔

سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ آدمی کو اپنی معیشت اور گذر اوقات کے لیے کوئی نہ کوئی کام کرنا چاہیے۔ شیخ عثمان بن فودی روزی کمانے کے لیے رسی بٹتے تھے۔ بلو کے بہنوئی سلیمان جو امیر کانو تھے وہ کھیتی کرتے تھے۔

زکوٰۃ کی تحصیل کے لیے انھوں نے ایک محکمہ قائم کیا تھا جو لوگ اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی اور پہلوتہی کرتے تھے ان سے زبردستی وصول کی جاتی تھی۔ اسی طرح صدقہ فطر بھی وصول کیا جاتا تھا۔ وراثت کی تقسیم کا بھی ایک علیحدہ محکمہ تھا جس کے لیے ایک مخصوص جج مقرر تھا اس کا لقب SALANKI سلانکی تھا۔ خلیفہ خاص طور پہ گھوڑ دوڑ کراتا تھا تاکہ عمدہ گھوڑے جنگ کے کام آسکیں۔

جو لوگ اس دور میں حج کو جاتے تھے وہ سوڈان ہو کر مکہ پہنچتے تھے۔

غرض خلیفہ نے پورے ملک کا انتظام نہایت عمدہ کر رکھا تھا۔ ہر شخص کو حکم تھا کہ وہ یا تو اپنے اہل و عیال کے لیے کھیتوں سے غلہ پیدا کرے یا کوئی اور ذریعہ رزق اختیار کرے۔ غلاموں کو صبح سے دوپہر تک اپنے مالک کا کام کرنے کے بعد باقی دن میں اپنی مرضی سے کام کرنے کی آزادی تھی وہ اپنی زمین میں جو غلہ اگاتے تھے وہ انہی کا ہوتا تھا۔

خلیفہ کو طب سے خاص مناسبت تھی اس موضوع پر انھوں نے ایک کتاب بھی تصنیف کی تھی۔ کلاپرٹن سے انھوں نے اس کی خواہش کی تھی کہ انگلستان سے ایک طبیب ان کے پایۂ تخت میں لایا جائے۔ خود اس کے

پاس بھی ایک طبیب تھا جس کا نام سیڈی شیخ (SIDI SHAIKH) تھا۔ خلیفہ کی طب سے دلچسپی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اس نے ایک باغ میں دواؤں کے درخت لگا رکھے تھے۔ امراض چشم کے لیے بھی ایک طبیب مقرر تھا۔ اس کا نام ندا کلائی (NDA KALAI) تھا۔ آنکھوں کا شفاخانہ اس کے گھر کے قریب ہی تھا جو آج تک قائم ہے۔ جب اس دواخانہ کو اس کی جگہ سے ہٹانے کی کوشش کی گئی تو اس میں کام کرنے والے اطبا نے اس تبدیلی کو پسند نہیں کیا اور کہا کہ خلیفہ محمد بلو نے جس جگہ شفاخانہ قائم کیا تھا وہاں سے ہٹ کر دوسری جگہ جانا ان کو گوارا نہیں ہے۔

میدان جنگ میں کام آنے والوں کے اہل و عیال کے لیے خلیفہ خبرگیری کرتا تھا۔ اس محکمہ کی سربراہ خود خلیفہ کی بیوی عائشتو تھیں۔ وہ زکوٰۃ کی رقم سے یتیموں اور بیواؤں کی ضرورتیں پوری کرتی تھیں۔ خلیفہ کو بھی یتیموں سے خاص ہمدردی تھی۔

عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی ترقی پر خلیفہ کی خاص توجہ رہتی تھی ان کے لیے ایک خاص مرکز بھی قائم کیا گیا تھا جس میں بعض عورتیں ڈاکٹر بھی تھیں[1] خود شیخ بلو کی صاحبزادی فاطمہ اچھی شاعرہ تھیں ان کی ایک نظم اب بھی موجود ہے جو نہایت معیاری زبان میں ہے۔ ظاہر ہے ایسی عمدہ نظم کوئی تعلیم یافتہ ہی لکھ سکتا ہے۔ اسی طرح شیخ عثمان بن فودی کی صاحبزادی اور خلیفہ بلو کی بہن حفصہ تو، خدیجہ تو، صفیہ تو، مریم اور اسماء تو سب صاحب ذوق شاعرہ تھیں۔

---

[1] عثمان دان فوڈیو ص ۶۰۔

نانا اسماء ایک بڑی عاقلہ اور نہایت تعلیم یافتہ خاتون تھیں جنھوں نے اپنا ایک مدرسہ بنایا تھا اور اس میں وہ تعلیم بھی دیتی تھیں ان کی نظمیں اور مراثی اعلیٰ درجہ کے ہوتے تھے یہ خاتون بھی شیہو عثمان کی بیٹی اور خلیفہ بلو کی بہن تھیں۔

کلاپرٹن انگریز سیاح رقمطراز ہے کہ خلیفہ بلو کے دور میں غلہ افراط تھا اور نہایت ارزاں۔ پھل تربوز، آلو، گیہوں اور چاول سے بازار بھرے تھے۔[1]

شہر میں مختلف پیشوں کے لوگ اپنے اپنے کاروبار میں منہمک رہتے تھے۔ لوہاری کے سلسلہ میں سب سے اہم شخصیت احمد ودعا کی تھی جس کے یہاں بھالے، برچھی اور تلواریں بنتی تھیں۔ اس کا لقب (SARKIN MAKERA) سرکن میکرا تھا۔ سرکن مغاذ شہر کے دروازوں کی مرمت اور چاندی کی مہریں بناتے تھے جن کو خلیفہ سرکاری کاغذوں پر استعمال کرتے تھے۔

کپڑا بُننے کی صنعت سکوٹو میں نہایت ترقی یافتہ تھی محمد ابل لابادی (MOHD ABUALLABADI) سب سے ماہر اس پیشہ کے صنعت کار تھے جو صفادا سے ہجرت کر کے سکوٹو آئے تھے اور یہاں انھوں نے اس صنعت کو ترقی دی تھی۔

خلیفہ محمد بلو کی بہن نانا اسماء نے ان کے مرثیہ میں ایک عمدہ نظم فلانی زبان میں کہی تھی جس میں وہ لکھتی ہیں:۔

خلیفہ بلو نے اپنے گرد سب کو جمع کر لیا تھا۔ فلانی ہاؤسا اور بوزو (BUZU) کو۔ انھوں نے ہر شخص کا خیال رکھا۔ انھوں نے اپنے ہر کام

[1] سفرنامہ کلاپرٹن جلد ۱ ص ۸۳۔

میں مذہب اسلام کو اپنا رہنما بنایا۔[1]

تصانیف پہلے اس کا ذکر آچکا ہے کہ خلیفہ محمد بلو بن عثمان بن فودی ایک کامیاب حکمراں اور بلند پایہ مصنف تھے وہ عربی زبان وادب میں بھی ممتاز اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھتے تھے انھوں نے اپنے عہد کی تاریخ پر بھی ایک عمدہ تصنیف یادگار چھوڑی ہے، جس میں اس دور اور ماحول کی مکمل تصویر کشی کی گئی ہے اس کا نام انفاق المیسور فی تاریخ بلاد التکرور ہے جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ شیخ عثمان کی زندگی اور حالات نیز ان کی جنگ وجہاد کے واقعات اور تبلیغی مساعی و مواعظ کا سب سے معتبر اور قابل وثوق ماخذ ہے، اس میں مصنف نے پہلے یہ بتایا ہے کہ ملک تکرور کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں ختم ہوتا ہے۔ اس نے شہر فور کو ابتدائے مشرق میں اور شہر اھیر کو انتہائے مغرب میں قرار دیا ہے۔ پھر خلیفہ محمد بلو نے اپنے والد کی مکمل سوانح عمری قلمبند کی ہے۔ اس کتاب کے وہ حصے بڑے قابل قدر ہیں جو شیخ عثمان بن فودی کے معاصر علماء سے متعلق ہیں۔ غزوات کا حصہ بھی اہم ہے جن میں وہ خود بھی شریک تھا اور بعض غزوات میں اس نے بطور سپہ سالار کے شجاعت کے جوہر دکھائے تھے اس لیے ان کی حیثیت چشم دید واقعات کی ہے۔ مصنف نے اس عظیم سیاسی کشمکش کی داستان پوری شرح وبسط سے بیان کی ہے جو شیخ عثمان اور ہاؤسا کے سلاطین کے درمیان شروع ہوئی اور جس میں فتح کا تاج تاریخ نے شیخ عثمان بن فودی کے سر پر رکھا۔ مصنف نے اپنی اس تصنیف میں سعدی کی

[1] عثمان بن فودی از شیہو شگاری ص ۴۴۔

تاریخ "تاریخ السودان" سے مدد لی ہے۔

ڈاکٹر علی ابوبکر کا یہ بیان محل نظر ہے کہ خلیفہ محمد بلو نے اپنی تصانیف میں اپنے والد کی طرح مذہبی مسائل و موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے اس لیے کہ ان کی سب سے عمدہ کتاب انفاق المیسور ہے جو در اصل اس دور کی تاریخ ہے، خود خلیفہ کے چچا عبداللہ بن فودی نے اپنی نظموں اور کتابوں میں اپنے بھائی اور امیر المومنین عثمان بن فودی کے جہاد، ان کے نظریات اور ان کی جنگوں پر بہت کچھ لکھا ہے اور حق یہ ہے کہ وہ زیادہ علمی و عملی صلاحیت کے حامل تھے محمد بلو بن عثمان کو ان سے زیادہ مناسبت و مشابہت معلوم ہوتی ہے، دونوں نے اپنے دور کی تاریخ میں عمدہ کتابیں لکھیں۔

(۲) ان کی دوسری کتاب کف الاخوان عن اتباع خطوات الشیطان ہے اس میں علمائے سو کا خصوصیت سے ذکر ہے۔

(۳) ارض الانکار: یہ ان کی پہلی تصنیف ہے جس میں مغربی سوڈان (تکرور) موجودہ نائیجیریا) کے قدیم مشرک بادشاہوں کی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔ یہ اور ان کی سب کتابیں عربی زبان میں ہیں۔ ایک مستشرق میجر بائرن (MAJOR BYRON) نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے جو چھپ گیا ہے مگر خود اصل عربی کتاب مخطوطہ کی شکل میں موجود ہے۔

اس کتاب سے بھی پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ محمد بلو کا رجحان تاریخ نویسی کی طرف تھا جب کہ ان کے والد نے تاریخ پر کوئی کام نہیں کیا۔

(۴) شفاء الاسقام فی ذکر مدارک الاحکام:۔ اس میں پہلے احکام

شرع کے متعلق احادیث درج ہیں پھر نصف آخر میں مصنف نے اپنے اساتذہ کا ذکر کیا ہے اور ان کتابوں کا تذکرہ بھی کیا ہے جو اس نے پڑھی تھیں اس سے ان کی علمی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔

(۵) الغیث الوبل فی سیرۃ الامام العدل:۔ اس کتاب میں مصنف نے اطاعت امیر، شعائر اسلام، فصل قضایا، امامت حدود و تشریع، تعمیر مساجد اور جہاد وغیرہ پر بحث و گفتگو کی ہے، یہ کتاب ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۶) العہود المسفرۃ فی الخصال التی تدرک بھا المغفرۃ: ۸۰ صفحات پر مشتمل یہ اوراد کا مجموعہ ہے جس میں ابن جوزیؒ، امام نوویؒ اور ابوالحسن شاذلیؒ کے اقوال بھی درج ہیں اور بہت سے قصص و احادیث سے بھی انھوں نے اس کتاب کو مزین کیا ہے۔

ان مستقل تصانیف کے علاوہ انھوں نے دس بارہ رسائل و مقالات بھی لکھے تھے اور قصیدہ بوصیری کی تخمیس بھی کی تھی جس سے ان کی شاعرانہ صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔[1]

[1] الثقافۃ العربیۃ فی نیجیریا مصنفہ ڈاکٹر علی ابوبکر طبع اول ۱۹۷۲ء ص ۲۸۵ تا ۲۹۰۔

فارسی زبان میں رامائنیں

از:

رام لعل نابھوی ۔ نابھا (پنجاب) ہندوستان

مہرشی والمیک ہندوستان میں سنسکرت کے پہلے کوی (شاعر) ہیں۔ ان کی پوری شاعری کا آغاز سنسکرت شاعری میں رامائن سے ہوتا ہے اور پورے سنسکرت ادب پر ان کی چھاپ ہے۔

سنسکرت میں بھشنڈی رامائن۔ ادھیاتم رامائن۔ ادبھت رامائن۔ آنند رامائن بھی لکھی گئیں اور ناٹک۔ مہا ناٹک، رامائن تھیم پر مبنی وجود میں آئے۔

جب سنسکرت کی تعلیم میں کمی آئی تو شمال میں گوسوامی تلسی داس اور جنوب میں کمبن نے اودھی میں اور تامل میں رامائنیں لکھیں۔ دونوں نے مہرشی والمیک کی کاوش کو سراہا ہے لیکن یہ دونوں رامائنیں اپنے رنگ میں لکھی گئی ہیں۔ ان کا تعلق مکمل طور پر والمیک کی رامائن سے نہیں ہے۔

والمیک کی رامائن نے ہندوستان کی مذہبی، اخلاقی، ثقافتی زندگی پر گہرا اثر قائم کیا اور اس گرنتھ کو لازوال شہرت حاصل ہوئی۔ یہ گرنتھ اتنا پر اثر ثابت ہوا کہ ہندوستان کی سرحدیں توڑ کر روس، جاوا، ملیشیا تھائی لینڈ، فلپائن، لاؤس، برما، کمبوجیا، انڈونیشیا، سنہال، کھیتان

وینٹین، تبکاک، جاپان۔ نیپال، سری لنکا، منگولیا، اٹلی اور دوسرے ممالک میں اپنا قبضہ جما بیٹھا۔

ادھر ہندوستان میں کناڈا، تیلگو، تامل، گجراتی، سنسکرت، انگریزی۔ مراٹھی، کشمیری، ہندی، بنگالی، اوڑیا، منی پوری، آسامی، پنجابی، عربی فارسی، اردو میں رامائنوں کا وجود ہوا۔ رامائن کی Sculptures

Folk Tales, Folk lores, Miniatures, Wall paintings,

Frescos, PALM leaves, Wood carvings, Teracottas,

میں تلاش ہوئی اور سینکڑوں مضامین اور کتابیں وجود میں آ گئیں۔ رامائن جاتک، گاتھا، رام لیلا، شادیوں میں ایسے گیت جن کا تعلق رام اور سیتا کی شادی سے ہے، بھی کھوج لیے گئے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ نئی نئی باتیں دریافت ہونے لگیں تو پھر دنیا بھر کی رامائنوں پر بھی کام شروع ہو گیا۔ چنانچہ ساہتیہ اکادمی دہلی نے بہت بڑے پیمانے پر رامائن سیمینار کرنے کے بعد

Critical inventory of Ramayan studies in the world.

بنانے کا سلسلہ شروع کیا جو پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے۔ پھر اور بھی سیمینار ہوئے۔ رامائن کے مختلف پہلوؤں اور مختلف رامائنوں میں تضادات زیر بحث آئے۔ ادھر علماء نے کتابیں لکھیں۔ غیر ممالک کے علماء نے ضخیم کتابیں شائع کیں۔ ان کے تراجم ہوئے۔ نئی باتیں نکالی گئیں۔ مذاہب پر رامائن کے اثرات زیر بحث آتے رہے علماء سر جوڑ کر بیٹھے۔ کچھ عقیدت سے کچھ نقد و نظر کے خیال سے، کچھ جاننے کے لیے اور کچھ بتانے کے لیے میدان میں آ گئے۔

اترے اور بات آگے نکلتی چلی گئی۔

لیکن مجھے عربی، فارسی، اردو میں رامائنوں کے ضمن میں کوئی ایسا معلوماتی مضمون نہیں ملا جس سے یہ پتہ چلے کہ ان زبانوں میں کتنی رامائنیں لکھی گئیں۔ کس نے لکھیں، کب لکھی گئیں، ایک دو مضامین اردو رامائنوں پر ضرور ملے۔ ایک فارسی رامائنوں پر بھی تھا لیکن نہایت سرسری۔ سوال یہ تھا کہ اس ملک میں عربی۔ فارسی۔ اردو کا چلن عام تھا۔ آزادی سے پہلے فارسی اور اردو کی تعلیم اسکولوں میں دی جاتی تھی۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ رامائن جیسا عنطیہ ان زبانوں میں نہ لکھا گیا ہو۔ اور وہ رامائنیں کافی تعداد میں نہ ہوں۔ چنانچہ ان زبانوں میں رامائنوں کی تلاش جاری رکھی اور عربی میں ۳۔ فارسی میں ۹۰ اور اردو میں ۱۷۰ رامائنوں کا پتہ چل گیا۔ ابھی اور ملنے کی امید ہے۔ اس مضمون میں صرف کچھ فارسی رامائنوں کا ذکر ہوگا۔

جو کچھ بھی سنسکرت زبان سے عربی میں منتقل ہوا وہ فارسی میں بھی منتقل ہوتا رہا۔ یہ سلسلہ مدت مدید سے چل رہا ہے اور آج بھی جاری۔ساری ہے۔ مغل حکمرانوں سے پہلے بھی ہندوستان میں فارسی کا چلن تھا اور یہ زبان ہندوستان میں عام تھی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی درباری زبان فارسی تھی اور جتنے بھی chronicles ملیں گے وہ سب فارسی زبان میں ہیں۔ پورا ادب اور پوری تاریخ فارسی زبان میں ہے، ہندوستانی ریاستوں سے جو مراسلے دوسری ریاستوں کو یا پھر برٹش سرکار کو جاتے تھے وہ فارسی میں نہایت خوشخط لکھے جاتے تھے۔ صفوی خاندان کے آنے سے پہلے ایران میں داستان سکندر۔ بختیار نامہ۔ دربار نامہ وغیرہ

فارسی زبان میں لکھے گئے۔ وہ اتنے مشہور ہوئے کہ فارسی نثر میں یا دوسری داستانیں رامائن۔ مہابھارت۔ دیومالائی کہانیاں ترجمہ ہوئیں۔

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلی کوشش سلطان زین العابدین نے جو کشمیر کے حکمران تھے، رامائن کو فارسی میں منتقل کرانے کی کی لیکن کچھ بھی دستیاب نہیں۔

اکبر نے باقاعدگی سے سنسکرت کی کتابوں کو فارسی میں منتقل کرنے کے لیے دارالترجمہ قائم کیا اور ابوالفضل کی سرکردگی میں اتھروید۔ رامائن۔ مہابھارت۔ گیتا۔ پران۔ راج ترنگنی وغیرہ فارسی میں ترجمہ ہوئے۔ عبدالقادر بدایونی نے رامائن کا ترجمہ فارسی نثر میں کیا۔ جو ۹۹۷ھ میں ختم ہوا۔ بدایونی نے شہنشاہ اکبر کا حکم مانا لیکن کام بے دلی سے کیا اور اسے زحمت سمجھا۔ اسے اس کام کو مکمل کرنے کے لیے چار سال لگے۔ بدایونی کا کہنا ہے کہ شہنشاہ نے اس کے کام کی قدر کی اور انعام دیا۔ اس رامائن کا قلمی نسخہ پاکستان میں موجود ہے[1]۔ فیضی فیاضی نے بھی رامائن کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ یہ قلمی نسخہ ہندوستان میں موجود ہے[2]۔ وظیفۂ فیضی کے نام سے ایک نسخہ رامائن کا فارسی میں ترجمہ کیا ہوا پاکستان میں موجود ہے[3]۔ ابوالفضل کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا ہوا ایک نسخہ رامائن کا پاکستان میں موجود ہے[4]۔

---

[1] دیکھئے نسخہ ہائے خطی فارسی جلد چہارم صفحہ ۲۱۵۵ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان

[2] ،، ،، ،، مرکز تحقیقات فارسی ہند نئی دہلی۔ لائبریری ندوہ لکھنؤ صفحہ ۷۶۰

[3] ،، ،، ،، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان جلد چہارم صفحہ ۲۱۵۱

[4] ،، ،، ،، ،، ،، ،، ،، صفحہ ۲۰۴۱

جہانگیر کے زمانے میں دو رامائنیں لکھی گئیں۔ ملا سعد اللہ مسیح کیرانوی نے "داستان رام و سیتا" کے نام سے رامائن فارسی میں منظوم لکھی۔ وہ سنسکرت زبان سیکھنے کے لیے اور سنسکرت ادب کا مطالعہ کرنے کے لیے بنارس میں رہے۔ اس رامائن کو اتنی شہرت ملی کہ اس کے قلمی نسخے بہت سی لائبریریوں میں ملتے ہیں۔ یہ نول کشور پریس میں ۱۸۹۹ء میں چھپی۔ بڑے سائز میں ۳ صد سے اوپر صفحات ہیں۔ اس رامائن کے متعلق علامہ اقبال نے ایک خط مہاراجہ سر کشن پرشاد کو لکھا کہ وہ اس رامائن کا مسودہ فراہم کریں تاکہ اس رامائن کو اردو نظم میں منتقل کیا جا سکے۔ چونکہ مسودہ دستیاب نہیں ہوا اس لیے بات آگے نہ چل سکی[1]۔ اس رامائن کے متعلق متضاد آرا ہیں اور بہت دلچسپ۔ مقالات شبلی تاریخی حصہ دوم میں لکھا ہے:۔

"ہمارے مضمون نگار دوست کو مسلمانوں کے لٹریچر اور تاریخ سے کس حد تک واقفیت ہے؟ مسیح کی نسبت وہ فرماتے ہیں۔

ملا مسیح کے نام تک کا پتہ نہیں چلتا۔

لیکن فارسی شعراء کا کوئی تذکرہ ایسا نہیں جن میں مسیح کا نام اور اس کے حالات نہ ہوں۔ امرائے جہانگیری میں مقرب خاں ایک مشہور امیر تھا۔ جو اصل میں پانی پت کا رہنے والا تھا لیکن کرانہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ مسیح اس کا پروردہ تھا۔ وہ در اصل کرانہ کا رہنے والا تھا۔ لیکن چونکہ مقرب خاں کے دامن تربیت میں پلا تھا، آقا کی طرح وہ بھی پانی پت

[1] دیکھیے محب وطن اقبال از سید مظفر حسین برنی۔

کے انتساب سے مشہور ہو گیا۔ تذکروں میں اس کی رامائن کا عموماً ذکر ہے۔ مآثر الامرا میں رامائن کے چند منتخب اشعار بھی نقل کیے ہیں"۔

مولانا شبلی آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"ملا مسیح اور ان کی رامائن کے متعلق جو خیالات ہمارے ہندو دوست نے ظاہر کیے ہیں اس کی یہ کیفیت ہے کہ بے شبہ رامائن کو قبول عام نہیں حاصل ہوا لیکن اس کی وجہ تعصب نہیں ہے۔ مسیح ایک معمولی درجے کا شاعر تھا۔ اساتذۂ فن میں وہ کبھی شمار نہیں کیا گیا۔ وہ رامائن کے بجائے اگر صحابہ کے حالات بھی لکھتا تب بھی کوئی نہ پوچھتا۔ رامائن کو اس قدر مقبولیت بھی ہوئی تو صرف اس وجہ سے کہ ایک نیا مضمون تھا"۔

مولانا شبلی یہ بھی لکھتے ہیں کہ "جو اشعار ہمارے ہندو دوست نے نقل کیے ہیں بے شبہ وہ تعصب سے لبریز ہیں"۔

عبدالودود اظہر کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ "رامائن" ہے۔ فرماتے ہیں۔

"رامائن مسیح یکے از بہترین منظومہ ہائی رامائن فارسی بہ شمار می رود۔ آں نہ تنہا از لحاظ قدامت بر دیگر منظومہ ہائی رامائن برتری دارد بلکہ از حیث شعریت و لطف نیز حائز اہمیت است"۔

ڈاکٹر ولی اللہ سلفی پٹنہ نے مسیح کی رامائن پر ایک مقالہ ڈاکٹریٹ کیلئے لکھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ملا مسیح اوسط درجے کا شاعر تھا۔ وہ مغل دربار میں مشہور نہیں ہو سکا۔ رامائن کی داستان ملا مسیح شروع کرتے ہیں۔

خداوندا ز جام عشق کن مست — کہ در مستی فشانم در جہاں دست

ملا مسیح اسے تاریخی واقعہ بتاتے ہیں۔

ازاں گفتم حدیث رام وسیتا　　نہ این افسانہ تاریخ است اینجا

دختران ہندوستان میں وصف بتاتے ہیں۔

زن است وی کند کار جوان مرد　　کند ہنگامہ پروانہ شد سرد
بہ مردن عاشقان بی اختیار اند　　ولی معشوق اینجا جان سپارند
ہمی بینم بسی ہندی نژادان　　کہ خود را بر صنم سازند قربان

بہرحال اس رامائن کی مقبولیت میں کوئی شبہ نہیں۔

دوسری رامائن جہانگیر کے عہد کی گردھرداس کی ہے۔ اس رامائن کا نسخہ پاکستان میں ہے[1]۔ یہ رامائن بھی منظوم ہے۔ آغاز میں لکھتے ہیں:-

ثنا و شکر آن بخشندہ جان را　　پدید آورد کو ہر دو جہان را

عبدالودود اظہر کی رائے ہے۔

اشعار این مثنوی ست و بی کیف سے باشد، در پایاں سے گوید۔

ہزار و سی و شش بگذشت از سال　　شد آخر نامہ در فرخندہ احوال
بہ سنوات از بکرما جیت کن ہم　　ہزار و ششصد و ہشتاد و یک ہم

گردھرداس کا کہنا ہے کہ سیتا زمین میں نہیں گئی بلکہ عالم بالا کیطرف گئی تھی۔

چو سیتا این خبر بشنید برخاست　　دو دست افراخت از ایزد جہان خود بست
بیاید محفہ از فلک ز د اندو د　　در آں محفہ نشست این ستمین رود

---

[1] دیکھئے فہرست ہائے نسخہ خطی فارسی ایران و پاکستان موزہ ملی پاکستان۔ ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں بھی ہے۔

اورنگ زیب کے عہد میں چندر من بیدل کا ئستھ پسر سری رام مدھیورنے "نرگستان" کے عنوان سے لکھی۔ اسے غلطی سے عبدالقادر بیدل کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ آغاز میں ہی شاعر کا نام اور وطن درج ہے۔

از آن دو بیت ساز و این مصنف　　کہ چندر من بود نام مولف
چو اندر مدھیوری گوشہ نشینم　　گل از باغ و بہار او بچینم[1]

بیدل کا بیان ہے کہ اس نے اس سے قبل نثر میں رامائن لکھی تھی۔ یہ منثور نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے اور بقول ایتھے اس کا سال تصنیف ۱۰۹۷ھ-۱۶۸۵ء ہے[2]۔

اگرچہ پیش از این این داستانی　　بہ نثر آوردہ ام در یک زمانی
کنوں خواہم کہ در نظم آورم باز　　شوم زین داستان پاک ممتاز

موجودہ مثنوی کی تکمیل ۱۱۰۴-۵ / ۱۶۹۲-۹۳ میں ہوئی۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل تاریخوں سے واضح ہوتا ہے۔

گر سفت آن مرشد خاص و عام　　بگفتا زہی نرگستان رام (۱۱۰۴ ہجری)
چو جستم از خرد گفتا کہ بر خواں　　طراوت بخش دلہا باغ ایماں (۱۱۰۵ ہجری)

یہ رامائن شہنشاہ اورنگ زیب کے نام معنون ہے۔ نرگستان چھ دفتر پر مشتمل ہے۔ پہلے پانچ دفتر بحر ہزج میں ہیں۔ آخری دفتر میں چونکہ لڑائی کے واقعات نظم کرنے تھے اس لیے شاعر نے اس کے لیے رزمیہ بحر متقارب کا انتخاب کیا ہے۔

چو در دفتر آخریں بود جنگ　　بہ بحر سخن طبع شد چوں نہنگ

---

[1] نرگستان رامائن بیدل۔ نولکشور ۱۸۷۵ء ص ۵ [2] ایتھے نمبر ۱۹۶۴ء۔

بصد طمطراق سخن در نمود — چو شہنامہ اینی نامہ را بر گشود

امانت رائے امانت کی فارسی رامائن بہت ضخیم ہے۔ اس کا قلمی نسخہ[1] پاکستان میں ہے۔ نولکشور پریس نے ۱۲۸۰ ہجری میں اسے شایع کیا۔ بڑے سائز کی ۹۷۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا تتمہ بالمیک رامائن ہے۔ کہ شد منجش خامۂ بالمیک۔ اس مثنوی کے ۳۰ ہزار بیت ہیں۔ ۲۵ سال صرف ہوئے۔ امانت نے بھاگوت پران بھی فارسی میں نظم کیا ہے۔ وہ بھی ایک ضخیم کتاب ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کتابیں منظوم لکھیں۔ ایک سین ملاحظہ ہو۔

سفر کردہ دانائی اقلیم راز — سخن میکند سر ز سوز و گداز
کہ چوں رام و سیتا و لچھمن چو ماہ — بیک سیر گشتند در قطع راہ
برنگ غریبان صحرا نورد — ز آرام و آسائش خویش فرد
گذشتند از وادی پر خطر — نمودند چوں اشک از خود سفر
گذشتی اگر پائی سیتا بہ خار — دل رام میگشت چوں گل فگار
باخلاص دل لچھمن دردناک — ہمیکرد از خس و خار پاک
نمودند آخر بجائے گذار — کہ دیدند تالاب آئینہ وار
صفا دشت آبش چناں در کنار — کہ طبع سخن گو بود بے غبار
بساحل درختی سبزی دشت جا — رسا تا بگردوں چو فکر رسا
بہر شاخ او طائراں در خروش — بکیفیت نالہ تاراج ہوش
دراں آب گلہائے نیلوفری — در آئینہ چوں عکس خیل پری

[1] دیکھئے نسخہ ہائے خطی فارسی مخطوطات جلد چہارم مرکز تحقیقات فارسی ایران پاکستان۔

استاد مہر سنگھ کی فارسی بالمیکی رامائن منظوم ۱۸۹۰ء میں مطبع گنیش پرکاش لاہور میں چھپی۔ بڑے سائز کے ۱۸۶ صفحات پر مشتمل ہے اور لفظ بہت چھوٹا ہے۔ استاد مہر سنگھ گوجرانوالہ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک پنجابی نے اتنی ضخیم رامائن کو کس طرح نظم کیا کہ فارسی محاورہ بھی برقرار رہا اور روانی میں بھی فرق نہ آیا۔ استاد مہر سنگھ کو سراپا بیان کرنے میں کمال حاصل ہے۔

آخر میں ہم اقبال نعمانی کی مختصر فارسی رامائن کا جو نثر میں ہے ذکر کرتے ہیں۔ ڈیمائی سائز کے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ایران میں چھپی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے دو جلدوں میں الگ سے رامائن فارسی میں لکھی ہے۔

ظاہر ہے کہ ۹۰ فارسی رامائنوں کا اس مختصر مضمون میں احاطہ نہیں ہو سکتا تھا۔ مسلم دانشوروں نے نظم و نثر میں اور ۶ زبانوں میں ۳۰ رامائنیں لکھی ہیں۔ قومی یک جہتی۔ مشترکہ تہذیب کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے اور یہ کہ ہماری داستانیں ہیں۔ ہم سب کی۔

ضروری تصحیح:۔ معارف ماہ جون سنہ ۹۰ء کے مضمون نعمت خاں عالی میں مندرجہ ذیل غلطیوں کی تصحیح کر لیجئے۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۳۰	حاشیہ نمبر۱ سطر۳	خطاب اور تخلص ثانی	خطاب اول اور تخلص ثانی	۴۳۷	۹	قضائے تدبیر	قضا تدبیر
۴۳۲	۸	شبفا پائی	شفا پالی	۴۳۹	۶	بھی خواہ بھی تھا	بھی خواہ تھا
"	۸	مقدر سے	مقدر اسے	۴۴۶	حاشیہ نمبر۱	بحضور پدر تخت	بحضور پدر بر تخت
۴۳۵	۱۷	درود	درود سے	۴۴۸	۱۱	وجوداست عفت	وجود است و عفت

تلخیصؔ وتبصرہؔ

اجودھیا میں رام مندر

حقیقت یا افسانہ؟

عصر حاضر میں ہندوستان کے نامور اور ممتاز مورخ پروفیسر رام شرن شرما کی ذات محتاج تعارف نہیں، قدیم ہندوستان کی تاریخ پر انکی گہری نظر ہے پٹنہ اور دلی یونیورسٹی میں وہ شعبہ تاریخ کے صدر رہ چکے ہیں اور اس وقت وہ انڈین کونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ (ICHR) کے فیلو ہیں، بابری مسجد کے متعلق ان کی ایک کتاب کی اشاعت کی خبر آچکی ہے، مگر ابھی یہ ہماری نظر سے نہیں گزری ہے، جناب پرنب، کے چودھری نے ایک ملاقات میں ان سے جوانٹرویو لیا ہے اس میں خاص طور پہ بابری مسجد کے متعلق انھوں نے ان سے سوالات کیے تھے جن کو ٹائمز آف انڈیا نے شایع کیا ہے، ذیل میں اسی کی تلخیص پیش کی جاتی ہے (ع۔ص)

اجودھیا کا قدیم ترین حوالہ کتاب اتھروادید میں ملتا ہے اس کا زمانہ تصنیف ۸۰۰ یا ۱۰۰۰ سال قبل مسیح بتایا جاتا ہے، اس حوالہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اجودھیا ایک اسطوری اور دیومالائی بستی تھی، جس میں صرف دیوتا رہتے تھے، اس میں آٹھ حلقے اور نو دروازے تھے، ہر سمت سے یہ روشنی کے ہالہ میں تھی، بدھوں کی ایک

کتاب SAMYUTTA NIKAYA تین سو سال قبل مسیح پرانی ہے اس کے مطابق اجودھیا، دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے، اس سے یہ توقطعی طور پر ثابت ہی ہو جاتا ہے کہ دریاے سرجو کے کنارے واقع موجودہ اجودھیا کوئی اور بستی ہے، والمیکی کی رامائن کی بنیاد پر ایم سی جوشی ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل آرکائیولوجیکل سروے آف انڈیا کا خیال ہے کہ یہ بستی دریاے سرجو سے کچھ فاصلہ پر ہونی چاہیے۔

ہندوؤں کے مذاہب وعقائد کی رو سے اجودھیا کو قرون وسطی میں زیارت گاہ کی حیثیت حاصل ہوئی، وشنو اسمرتی کے باب پچاسی میں تقریباً باون زیارت گاہوں کا بیان ہے، ان میں شہر جھیل، دریا اور چشمے وغیرہ سب شامل ہیں، مگر اجودھیا کا ذکر مفقود ہے۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ وشنو اسمرتی کا زمانہ تین سو سال بعد مسیح کا خیال کیا جاتا ہے، اس طرح اس کی معلومات تاریخی اعتبار سے جدید تر ہیں اس کے علاوہ بھی کسی ماخذ میں یوپی کے کسی حصہ میں سولھویں صدی تک کسی رام مندر کا سراغ نہیں ملتا۔ یوپی کے شعبہ آرکائیولوجی کے سابق ڈائریکٹر جناب آر پی سنگھ نے اجودھیا میں تقریباً سترہ مقامات پہ کھدائی کی، رن موچن گھاٹ اور گپتر گھاٹ کو بھی کھودا گیا لیکن ان تمام جگہوں پہ انسانی آبادی کے جو آثار و نقوش پائے گئے ہیں، وہ دوسری صدی قبل مسیح سے پہلے کے نہیں ہو سکتے،

اجودھیا کی کسی حکومت کے کسی سکہ، مہر یا نشانی کا بھی کوئی سراغ نہیں ملا ہے، آثار قدیمہ کے ماہرین کے نزدیک سکوں کی ایک قسم 'ایودھیا کوائن' کے نام سے معروف ہے، ان سکوں کا عہد دوسری صدی قبل مسیح کے اواخر سے پہلی اور دوسری صدی بعد مسیح تک متعین کیا گیا ہے، لیکن ان سکوں میں بھی کہیں ایودھیا کے

نام ونشان کی صراحت نہیں ہے، یہ تو اجودھیا کی تاریخی حیثیت ہے۔

بابری مسجد کے متعلق یہ روایت عام ہے کہ بابر نے رام مندر کو مسمار کر کے اسکی بنا ڈالی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک طرف قوت واقتدار کے نشہ اور ہوس مال وزر کے متعدد ایسے واقعات ہیں جن کی بنا پر ہندو اور مسلمان دونوں کے برسر اقتدار طبقہ کو ظالم وجابر ثابت کیا جا سکتا ہے تو دوسری طرف دونوں قوموں کے حکمرانوں کی رواداری اور انسان دوستی کی بھی بے شمار مثالیں موجود ہیں، اس لیے صرف مسلمان حکمرانوں کو ظالم وسفاک اور ہندو راجاؤں کو متحمل وروادار ثابت کرنا قطعاً ناانصافی ہے۔ بابری مسجد میں بزور طاقت رام مورتی نصب کرنے کے بعد وہاں کے قدیم ستونوں میں تصویریں کندہ کی گئی ہیں، یہ فرقہ پرستی کے فروغ واشاعت کی سنگین جسارت ہے، مثلاً ایک تصویر میں یہ منظر پیش کیا گیا ہے کہ بابر کے فوجی، رام جی کے فرضی مندر کو تاراج اور ہندوؤں کا قتل عام کر رہے ہیں، اس منظر کے نیچے عبارت میں یہ تحریر ہے کہ رام مندر پر حملہ کے وقت بابر کے فوجیوں نے پچھتر ہزار ہندوؤں کو تہہ تیغ کیا اور ان کے خون سے بابری مسجد کی تعمیر کی، یہ تحریر ایسی ہی لغو اور باطل ہے جس طرح یہ روایت کہ بابر نے رام مندر کو مسمار کر کے مسجد کی تعمیر کی۔

بابر کی اجودھیا میں آمد ہی تشنہ ثبوت ہے، البتہ وہ گوالیار گیا تھا اور اس نے وہاں کی مذہبی اور دوسری مختلف شاندار عمارتوں اور ان کے طرز تعمیر کا ذکر بڑے وجد آگیں انداز میں کیا ہے، گوالیار میں مسلمانوں کی طرف ایک مسجد تھی جسے التمش نے تعمیر کرایا تھا، باقی تمام عمارتیں ہندو طرز تعمیر کی نمائندہ

تھیں، اب یہ ہمارے عہد کی ستم ظریفی ہے کہ ہندو آرٹ اور طرز تعمیر کے ایک شیدائی پر یہ تہمت عائد کی جاتی ہے کہ اس نے ایک قدیم ہندو مندر کو برباد کیا حالانکہ یہ وہ الزام ہے جس کا سارے فسانہ میں کہیں ذکر ہی نہیں ہے، اسلیئے یہ تو بالکل واضح اور روشن ہے کہ بابری مسجد، اجودھیا میں کسی رام مندر کو توڑ کر نہیں بنائی گئی، اترپردیش کے شعبہ آثار قدیمہ نے ۱۹۸۰ء تک اجودھیا میں تقریباً چھ ہزار چھوٹے بڑے مندروں کا شمار کیا تھا، رام کے بھکتوں کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اس تعداد میں اور اضافہ کریں لیکن فرقہ پرستوں کی اس کی اجازت ہرگز نہیں ملنی چاہیے کہ وہ ایک مسجد کو توڑ کر ایک متنازعہ زمین پر مندر بنائیں، البتہ موجودہ حالات میں یہ رائے مناسب معلوم ہوتی ہے کہ بابری مسجد کو ایک قومی یادگار کی حیثیت دیدی جائے۔

اس سارے قضیہ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ انیسویں صدی میں مذہبی جذبات کے استحصال کی استعمارانہ سیاست کے تحت، برطانوی مورخین اور ماہرین آثار قدیمہ نے مسلسل اور مربوط طریقہ سے مسلم حکمرانوں پر یہ الزام تراشی کی کہ انھوں نے مندروں کو برباد کیا اور اس کے لیے انھوں نے تاریخی صداقت کو پس پشت رکھ کر مقامی روایتوں اور کہانیوں کا سہارا لیا، چنانچہ ۱۸۹۱ء میں اے فیوہرر نے بالکل غیر مستند اور بے بنیاد طریقہ سے یہ لکھا کہ اجودھیا میں مسلمانوں نے تین مندر تاراج کیے جن میں سے ایک رام جی کی جائے پیدائش بھی ہے، افسوس یہ ہے کہ کچھ اہم

ہندوستانی مورخین ان انگریز مورخوں کے دام تزویر کا شکار ہو گئے اور عجیب بات یہ ہے کہ بنگال کے چند نمایاں مورخوں نے بنگال میں برطانوی حکومت کے قیام کو خوش آمدید کہا اور اسے اپنے لیے نعمت و باعث برکت تصور کیا، گو برطانیہ کی سامراجی حکومت، ہندو اور مسلمان دونوں کے حق میں ظالم تھی لیکن سرجدوناتھ سرکار جیسے اہم مورخ نے اس کے مظالم کو نظر انداز کر کے اسے رواداری حکومت کا نام دیا ہے اور بدقسمتی سے ان کے ان ہفوات کو قبول کر لیا گیا، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اے، ایل سریواستو جیسے مورخین نے پاکستان کے قیام کا رشتہ سندھ میں عربوں کی آمد (۷۱۲ء) سے جوڑ دیا ہے۔

ہند قدیم کی عظمت سرائی کے لیے ملک میں پہلی بار کلکتہ یونیورسٹی میں ہند قدیم کی تاریخ اور تمدن کے مطالعہ کے لیے ایک شعبہ قائم کیا گیا، اس کے ساتھ ہی اسلامی تاریخ کا بھی ایک شعبہ وہاں قائم کیا گیا، لیکن تعجب اس پر ہے کہ ہندو تاریخ کے مطالعہ کے نام پر قائم اس شعبہ میں راجپوت، مرا ٹھا اور سکھ تاریخ کے مطالعہ پر ہی زور دیا جا رہا ہے۔

(ع - ص)

بابری مسجد

اجودھیا کی تاریخی بابری مسجد پر دارالمصنفین کی ایک پر از معلومات اور محققانہ کتاب جس میں اس کے مالہ وما علیہ پر تاریخ کی ہم عصر کتابوں، دستاویزوں، حق پسند مورخوں کے بیانوں اور اب تک کے تمام عدالتوں کے فیصلوں کی مدد سے نہایت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، ساتھ ہی مسلمانوں میں رامائن اور رام چندر کے احترام اور رامائن کے بعض ہندو نقاد کے عنوان سے دو اہم ابواب بھی ہیں۔

قیمت :- ۲۰ روپیے - منیجر

اخبار علمیہ

عالمی زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر کی خبروں سے مسلمانوں کی خوشی فطری ہے، اب معلوم ہوا ہے کہ ہنگرین زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ مع تفسیر AKORAN کے نام سے بوڈاپسٹ سے شایع ہوا ہے اس کے مترجم و مفسر ڈاکٹر رابرٹ سیمن ہیں، جنھوں نے جامعہ ازہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، مطالعہ قرآن میں قدیم اور جدید عربی ادب کی اہمیت ان کا خاص موضوع تھا، اپنے اس ترجمہ و تفسیر میں انھوں نے قدیم کتب تفسیر و حدیث، سیر و تاریخ اور جاہلی شاعری سے پورا استفادہ کیا ہے، ڈاکٹر رابرٹ سیمن کی دوسری کتابیں AKORAN VILAG (جہان قرآن) اور AKDRAN SZE اور MIVENYEBEN اور حقیقت اسلام بھی قرآنیات ہی سے متعلق ہیں۔

یورپ میں قرآنیات سے جس شغف کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ حیرت انگیز ہے، برطانیہ میں دی اسلامک فاؤنڈیشن نامی ادارہ اپنی خدمات و مساعی جمیلہ کے لیے اب محتاج تعارف نہیں، حال ہی میں اس ادارہ کے ایک نوجوان فعال اور باصلاحیت رکن اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کے نواسہ ڈاکٹر عبدالرحیم قدوائی نے 'معارف' کے لیے ادارہ کے سہ ماہی مجلہ 'دی مسلم ورلڈ بک ریویو' کے چند شمارے بھیجے، وہ خود بھی اس مجلہ کی مجلس ادارت میں شامل ہیں، اس کو

دیکھ کر اندازہ ہوا کہ یورپ میں علوم اسلامیہ پہ مسلمان اور مستشرقین اہل قلم کے ذریعہ کس درجہ وقیع کام انجام پا رہا ہے، اس قابل قدر مجلہ کے بعض مفید مضامین کی تلخیص ان شاء اللہ معارف میں بھی پیش کی جائے گی۔

اسلامی تاریخ و تمدن اور اسلامی علوم و فنون کی تحقیق و ترویج میں جو ادارے جدید ترین طرز پہ سرگرم عمل ہیں ان میں استنبول (ترکی) کے ادارہ دی ریسرچ سنٹر فار اسلامک ہسٹری، آرٹ اینڈ کلچر (iRCiCA) کا ذکر ان صفحات میں متعدد بار آچکا ہے، گذشتہ ماہ جون میں اس کے قیام کو دس برس پورے ہوگئے، ڈاکٹر اکمال الدین احسان اوغلو کی نگرانی میں اس کی کارکردگی بڑی اچھی رہی۔ تقریباً ۲۱ کتابیں شایع ہوئیں، ان میں تمام دنیا میں قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر کا مکمل کیٹلاگ، ترکی کے کتب خانوں میں موجود خطی مخطوطات کی مکمل فہرست، اسلامی ثقافتی اداروں کی ایک بین الاقوامی ڈائرکٹری وغیرہ نہایت اہم ہیں، ادارہ کی دسویں سالگرہ پر ہم اس کو تبریک پیش کرتے ہیں اور اسکی مزید ترقی کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں۔

جہاں مستشرقین کی خدمات کا اعتراف ناگزیر ہے وہاں ان کی تحریروں کا احتساب بھی علمی فریضہ ہے، کویت کے موقر مجلہ 'العربی' میں مشہور عربی اہل قلم ڈاکٹر عبدالعزیز کامل کا ایک مضمون "سیرت النبیؐ پر ہمارا بھی حق ہے" کے عنوان سے شایع ہوا ہے اس میں انھوں نے ان مستشرقین کا ذکر کیا ہے جو طبری اور واقدی کی بعض غیر محتاط اور بے سروپا روایتوں کی بنا پر افسانے وضع کرتے ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ نبی کریمؐ کی سیرت نگاری کے لیے اس

دقت نظر کا ہونا شرط اول ہے جو واقعات و روایات کی قوت و ضعف اور حسن و قبح کا ادراک کر سکے، اس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں کہ ان کی نظر میں سیرت پر سب سے بہترین اور عظیم الشان کتاب علامہ شبلیؒ کی سیرۃ النبیؐ ہے جس کی امتیازی شان یہ ہے کہ واقعات و روایات کے رد و قبول میں بجائے رجال تاریخ کے رجال حدیث کی شرطوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے، انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کتاب کا عالمی زبانوں اور خاص طور پر فرانسیسی زبان میں ضرور ترجمہ کیا جانا چاہیے اور اس کی اشاعت کے لیے موتمر اسلامی کو پیش قدمی کرنا چاہیے۔

عربی زبان کی خوبی، دلکشی اور اہمیت مسلم ہے لیکن ایک ہندو صحافی نے اسے جس نظر سے دیکھا ہے وہ حسن نظر کی عمدہ مثال ہے، دنمان ٹائمز ہندی کا ایک نیا ہفتہ وار اخبار ہے، اپنے مضامین اور تبصروں کے تنوع کی وجہ سے اس کی اشاعت بہت جلد ایک لاکھ سے زیادہ ہوگئی ہے، اس میں عصر حاضر میں اسلام کے کردار پر ایک تحریر نرمل گوسوامی نے سپرد قلم کی ہے جس میں اور باتوں کے ساتھ انھوں نے یہ لکھا ہے کہ "میرے نزدیک اسلام کا خوبصورت ترین تحفہ عربی رسم الخط اور طرز تحریر ہے، جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ خطاطی، خدا کی سب سے بڑی عبادت ([illegible]) ہے دنیا میں کوئی اور رسم الخط نہ اتنا پاکیزہ و مقدس ہے اور نہ تہذیب و تمدن کا نمائندہ، یہ اسلام کی سب سے طاقتور شناخت ہے، عربی رسم الخط کا ایک لفظ ایک کامل تہذیب و ثقافت اور اسلام کی قوت و برتری کا احساس

دلاتا ہے، مسجدوں، مناروں، مقبروں، سکوں، تلواروں، محلوں اور قلعوں کے علاوہ اللہ کی عظمت کی شاید یہ رسم الخط بھی ناقابل فراموش علامت ہے" نرل گوسوامی کے اس مضمون کا عنوان ہے "بہت مشکل ہے بھلا پانا اسلامی ठाठ" (شان وشوکت)

یہ خبر بھی خوش آئند ہے کہ اہم مآخذ و مراجع کے طبع جدید کے لیے حکومت عراق نے 'لجنۃ احیاء التراث الاسلامی' کو ۳۵۰ ہزار دینار مخصوص کیے ہیں، اب یہ لجنۃ طبرانی کی المعجم الکبیر، بیہقی کی السنن الصغریٰ اور کتاب اخلاص حملۃ القرآن، ڈاکٹر عبد الملک سعدی کی میزان الوصول فی نتائج العقول اور رسالہ طب القلوب کو جدید تحقیق و ترتیب کے ساتھ شایع کر رہی ہے۔

اور یہ عبرتناک خبر بھی ملاحظہ ہو کہ پاکستان مشروبات کی درآمد پر ۲۰۰۰ ملین اور پان اور چھالیہ کی درآمد پر ۳۳۲ ملین روپیے خرچ کرتا ہے لیکن کتابوں پر صرف ۱۳۷ ملین روپیے۔

ہندوستان میں بھی کتابوں کا کاروبار زیادہ حوصلہ افزا نہیں ہے اردو کا ذکر ہی کیا، انگریزی اور ہندی کے بڑے ناشرین بھی اس کساد بازاری سے پریشان ہیں، ہندوستانی ناشرین کتب کی تنظیم فیڈریشن آف پبلشرز اور بک سیلرز ایسوسی ایشن کے خبرنامہ سے معلوم ہوا کہ اشاعت کے میدان میں ہندوستان پہلے ساتویں نمبر پر تھا اور اب وہ سترہویں پوزیشن پر آگیا ہے، البتہ نسائیات کے متعلق لٹریچر کا کاروبار نفع بخش ہے، ایک عورت ناشر مسز اروشی نے اس پر یہ دلچسپ تبصرہ کیا کہ "یہ لطیفہ نہیں، حقیقت ہے کہ کسی ٹائٹل پر لفظ 'عورت' چسپاں کر دیجئے تو اسے فروخت ہی ہونا ہے، معیار کی چنداں ضرورت نہیں"۔

(ع۔ص)

معارف کی ڈاک

مکتوب پاکستان

جنجیل، پسنگھوئی
ضلع جہلم۔ پاکستان

۱۹ جون سنہ ۹۰ء

محب مکرم جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ

چند دن ہوئے آپ کا خط ملا تھا۔ میں اپنے دوست جناب حاجی عبدالغفار صاحب سے برابر رابطہ قائم کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ آپ کا کام ضرور ہوگا۔ دیر ضرور ہوگئی ہے اور اس پر میں معذرت خواہ ہوں۔

دارالمصنفین کی مطبوعات کی خریداری کے لیے IMPORT اور EXPORT لائسنس بنوانے کی کوشش کروں گا، اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے کاروباری[1] سلسلے میں کامیابی و کامرانی نصیب فرمائے آمین ثم آمین۔

افسوسناک خبر یہ ہے کہ میری سب سے چھوٹی بیٹی عاصمہ گلزار جس کی عمر ڈیڑھ سال تھی، کچھ دن بیمار رہی اور پھر اللہ کریم نے اسے اپنے پاس بلا لیا ہے، بہت پیاری بیٹی تھی۔ بس اللہ کریم کو یہی منظور تھا، اس کے داغ مفارقت کے بعد

---

[1] مکتوب نگار عرصہ سے مسقط میں ڈیفنس میں ایک اچھے عہدہ پر تھے مگر اب ملازمت ترک کرکے اپنے وطن میں کتابوں کا کاروبار کر لیا ہے، اللہ تعالیٰ اس میں برکت دے آمین

"ض"[2] ہم سب اس غم میں آپ کے شریک ہیں۔

مگر سونا سونا سا لگتا ہے بہرحال اللہ کریم کی حکمت و علم سے کون آگاہ ہو سکتا ہے،
اللہ کریم اسے ہمارے لیے وسیلۂ جنت بنائے اور ہمیں صبر جمیل عطا فرمائے آمین! ثم آمین۔

ہندوستان میں بین الاقوامی پیمانے پر ایک سیمینار ہو رہا ہے غالباً ۱۹، ۲۰، اکتوبر کو ہوگا، ہمارے ایک مخلص دوست جناب سید ظل الرحمن صاحب جو کہ مسلم یونیورسٹی طبیہ کالج میں علم الادویہ کے سربراہ ہیں، ایک دعوت نامہ بھیجا ہے، شاید تیاری ہو جائے، ویزا وغیرہ اسی بہانے آسانی سے مل جائے گا، سیمینار کا موضوع بھی علم الادویہ ہی ہے، امکانات ہیں کہ آپ بھی وہاں ضرور شامل ہونگے، اگر پروگرام بن گیا تو آپ سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔

اللہ کریم جناب زبیری صاحب کو صحت عاجلہ و کاملہ نصیب فرمائے آمین! ثم آمین، میری طرف سے مزاج پرسی کر دیں[1]۔

میری طرف سے اپنے تمام متعلقین، دیگر احباب اور رفقائے دار المصنفین کو حسب مراتب بہت بہت دعائیں اور سلام۔

معارف میں حضرت مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب کے ذریعے علامہ سید سلیمان ندوی کا خط بہت پسند آیا۔ اللہ کے فضل و کرم سے معارف کا معیار قائم ہے اور انشاء اللہ قائم رہے گا۔ اللہ کریم آپ کے حامی و ناصر ہوں۔

مخلص گلزار احمد ملک

---

[1] دار المصنفین کے آفس سپرنٹنڈنٹ پروفیسر محمد مجید زبیری گزشتہ چار پانچ ماہ سے علیل اور اپنی صاحبزادی کے ساتھ علی گڑھ میں زیر علاج ہیں، قارئین معارف سے بھی ان کی صحتیابی کے لیے دعا کی درخواست ہے" ض "

مطبوعات جدیدہ

پاکستانی مطبوعات

پاکستان میں دار المصنفین کے قدردانوں اور بہی خواہوں کا حلقہ بہت وسیع ہے، اس کی جانب سے یہاں کی مطبوعات اور معارف کی خریداری کا مطالبہ برابر ہوتا رہتا ہے مگر افسوس کہ دونوں ملکوں میں تجارت و مراسلت کی دشواری اور ڈاک کے مصارف کی زیادتی کی وجہ سے دار المصنفین کی کتابیں بھیجنا ممکن نہیں، تاہم وہاں کے اہل علم و قلم اپنی تصنیفات دار المصنفین کے کتب خانہ اور معارف میں تبصرہ کیلئے برابر ارسال کرتے رہتے ہیں، جس کے لیے ہم ان کے بہت شکر گذار ہیں، وقتاً فوقتاً ان کتابوں پر معارف میں تبصرہ بھی ہوتا رہا ہے مگر ان کی کثرت کی وجہ سے معارف کی چند اشاعتیں پاکستانی مطبوعات پر مختصر تبصرہ کے لیے مخصوص رہیں گی" ض "

خطبات بہاولپور از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، طباعت ٹائپ، صفحات ۴۷۶ قیمت ۱۵۰ روپیے، پتہ: ادارہ تحقیقات اسلامی پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۵، اسلام آباد، پاکستان۔

اسلام و اسلامی علوم کے نامور فاضل اور مشہور محقق و مصنف ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پیرس کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، انھوں نے کئی برس پہلے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کی دعوت پر بارہ خطبے دیئے تھے جن کا مجموعہ اسی زمانہ میں چھپے

اہتمام سے بہاولپور یونیورسٹی نے شایع کیا تھا، اس کا دوسرا ایڈیشن بھی وہیں سے چھپا تھا مگر تیسرا اور اب چوتھا ایڈیشن ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد نے شایع کیا ہے، اس وقت یہ چوتھا ایڈیشن ہمارے پیش نظر ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ڈاکٹر صاحب کی تصحیح، ترمیم اور اضافہ کے بعد شایع کیا گیا ہے، پہلے ایڈیشن پر معارف میں مفصل تبصرہ کیا جاچکا ہے، ان خطبات میں اسلام کے بنیادی مآخذ قرآن مجید، حدیث نبوی اور فقہ و اجتہاد کی تاریخ اور اسلامی عقائد، عبادات اور احسان و تصوف کی حقیقت واضح کی گئی ہے، پھر عہد نبویؐ میں مملکت اور اس کے نظم و نسق نظام دفاع و غزوات، اس دور کے نظام تعلیم، عدلیہ و مالیاتی نظام، غیر مسلموں سے برتاؤ اور اسلام کے قانون بین الممالک پر مفید اور سیر حاصل بحث و گفتگو کی ہے جس کے مطالعہ سے قاری کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، یہ خطبے دراصل ڈاکٹر صاحب کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق اور گہرے غور و فکر کا نتیجہ اور ہر صاحب علم کے مطالعہ کے لائق ہیں۔

جمال مصطفےؐ جلد دوم و سوم } مرتبہ جناب عبد العزیز عرفی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات جلد دوم ۲۲۴ و جلد سوم ۲۴۸ مجلد مع گرد پوش قیمت جلد دوم ۲۵ روپیہ و جلد سوم ۳۰ روپے، پتہ: گیلانی پبلشرز ۱۸/۲ - الیوسف چیمبرز شاہراہ لیاقت (نئی چالی) کراچی۔

سیرت نبویؐ مسلمانوں کا بہت محبوب موضوع ہے اور اس پر ہر زبان میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے جس پر مصنف کو حکومت پاکستان کی وزارت امور مذہبی نے پانچ ہزار کا انعام دیا ہے، اس کا انداز

سیرت کی عام کتابوں سے مختلف اور جدا ہے، اس کی پہلی جلد ہماری نظر سے نہیں گزری جس میں ان اصولوں اور قاعدوں کو بیان کیا گیا ہے جنھیں زیر نظر کتاب کی ترتیب و تدوین اور تصنیف و تالیف میں مدنظر رکھا گیا ہے اس لیے اس پر اظہار خیال کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے، دوسری جلد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی اور تیسری جلد میں آپؐ کے مدنی دور کے بعض واقعات و حالات سپرد قلم کیے گئے ہیں، ان جلدوں میں مصنف نے متن میں قرآنی آیتوں کا ترجمہ دیا ہے اور حواشی میں سیرت نبویؐ کے واقعات پیش کیے ہیں، مثلاً دوسری جلد کا آغاز سورۂ یونس کی آیات کے ترجمہ سے کیا ہے اور حواشی میں مندرجہ ذیل چار عنوانات کے تحت واقعات سیرت تحریر کیے ہیں (۱) مشرکین کے اعتراضات اور آپؐ کی قبل بعثت زندگی (۲) دشمن رسول مسیلمہ کذاب (۳) آپؐ کی دعا سے عذاب قحط دور ہوا (۴) قرآن انسانیت کا نقیب اور معجزۂ رسولؐ، اس جلد کے پیش لفظ میں مصنف نے بتایا ہے کہ "شان نزول اور سورہ میں بیان کردہ واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے سیرت طیبہ کے واقعات کو مربوط کیا گیا ہے" مگر یہ تکلف سے خالی نہیں ہے اور اس میں یک گونہ دوراز کار توجیہ سے بھی کام لیا گیا ہے، اس کے علاوہ جب سورہ کے شان نزول کو مدنظر رکھا گیا ہے تو پھر آپؐ کی بعثت سے قبل کی زندگی اور مسیلمہ کذاب کے واقعہ کو کس طرح چسپاں کیا جا سکتا ہے جو مدنی اور آپؐ کے آخری دور کا واقعہ ہے، علاوہ ازیں جس آیت کے بارہ میں کہا گیا ہے کہ اس میں مسیلمہ کی طرف اشارہ ہے وہ اس بارے میں صریح نہیں ہے اگر اسی طرح سے آیات کو منطبق کیا جائے تو اس کی متعدد اور مثالیں بھی مل سکتی ہیں، اسی طرح سورۂ نبا کے ضمن میں بیعت عقبہ ثانیہ کا واقعہ

نقل کیا گیا ہے اور سورۂ نازعات کے ضمن میں صحابۂ کرامؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کی اجازت دینے کا ذکر کیا ہے اور آخر میں سورہ سے واقعہ کی مناسبت یہ بتائی ہے کہ "یہی شب و روز رہے ہوں گے کہ درج بالا سورۂ مبارکہ (نبا) کا نزول ہوا پھر انہیں دلائل کے ساتھ دعوت حق دی گئی روز جزا کی وضاحت کی گئی کہ یہ ظالم اب بھی ایمان لے آئیں لیکن وہ تو خود اپنی عاقبت کے دشمن بنے ہوئے تھے" (ص ۳۷۹/۲) مگر یہ مناسبت کس قدر بعید ہے، تیسری جلد (مدنی) کی ابتدا سورہ مطففین سے کی گئی ہے اور حواشی میں یہ واقعات زیر بحث آئے ہیں (۱) ہادی مرسل صلی اللہ علیہ وسلم کا مدینہ میں ورود (۲) قبا میں آمد (۳) مسجد قبا کی تعمیر (۴) قبا سے روانگی (۵) آپ کا پہلا خطبہ جمعہ (۶) آپ کا والہانہ استقبال (۷) آپ کا قیام ابو ایوب انصاری کے مکان پر (۸) مسجد نبویؐ کی تعمیر (۹) مدینہ کا ماحول، یہ واضح رہے کہ زیر بحث سورہ مکی ہے اور اس سے مدنی دور کے واقعات مربوط کیے گئے ہیں، سورہ کے مضمون سے صرف آخری عنوان کی اس قدر مناسبت ہے کہ ناپ تول میں کمی اور سودی کاروبار یہودی کرتے تھے، یہ مثالیں زیر نظر جلدوں کی نوعیت کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ سیرت نبویؐ کا سب سے مستند اور صحیح ماخذ قرآن مجید ہی ہے، جس کو عموماً سیرت نگاروں نے نظر انداز کیا ہے اس لیے اس کی روشنی میں سیرت طیبہ کو مرتب کرنا بہت مستحسن ہے۔ قدما میں قاضی عیاض مالکی نے اس کی یک گونہ کوشش کی ہے اور اس دور میں مولانا شبلیؒ اور مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم اس کے بڑے مناد تھے، فاضل مرتب کو دور از کار توجیہات چھوڑ کر اسی انداز پر سیرت نبویؐ کو مرتب کرنا چاہیے تھا

اور آیتوں کے ترجمے اور اخذ نتائج میں مزید احتیاط سے کام لینا چاہیے تھا۔

(۱) ریگ رواں   از جناب حکیم محمد سعید صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت

(۲) ماوراء البحار   و طباعت عمدہ، صفحات (۱) ۴۴۸ (۲) ۲۵۶ مجلد مع خوبصورت گرد پوش، قیمت (۱) ۱۲۵ روپیے (۲) ایک سو روپیے ناشر ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، ہمدرد سینٹر، ناظم آباد، کراچی، ۷۴۶۰۰۔

جسمانی مریضوں کی طرح حکیم حافظ محمد سعید کی مسیحائی مسلم قوم میں زندگی کی روح پھونکنا اور اسے تب و تاب اور تازہ ولولہ عطا کرنا چاہتی ہے جو ایمانی، اخلاقی اور ثقافتی حیثیت سے مردہ اور اپنے اختلاف و انتشار کی وجہ سے بالکل پسپا اور بے دم ہو چکی ہے، یہ فیضان خداوندی بھی ہے اور حکیم صاحب کی غیر معمولی عملی قوت اور مسلسل محنت و ریاضت کا ثمرہ اور ان کی چاق و چوبند، با اصول اور مرتب زندگی کا کرشمہ بھی کہ وہ اپنی حیرتناک حد تک بڑھی ہوئی طبی مصروفیت اور ملک و بیرون ملک کی اکثر علمی، ادبی، ثقافتی اور سیاسی سرگرمیوں میں شرکت کے باوجود پڑھنے لکھنے کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں، ان کا ذوق بہت متنوع اور ان کے کاموں میں بڑی برکت ہے، چنانچہ انھوں نے مختلف موضوعات پر بکثرت کتابیں لکھی ہیں، ان کی علمی و عملی سرگرمیوں کی اصل جولان گاہ ہمدرد کراچی ہے، جہاں انھوں نے علم و حکمت اور ہنر کا ایک تازہ جہاں آباد کیا ہے، حکیم صاحب کی علمی، تعلیمی، تحقیقی، مذہبی، ملی، طبی اور فلاحی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، ان مختلف النوع اشغال کی بنا پر سفر و سیاحت ان کی زندگی کا لازمی عنصر بن گیا ہے، جس کے سفرنامے بھی انھوں نے لکھے ہیں، یہ ان کا نواں اور دسواں سفرنامہ ہے، طب میں رسوخ و مہارت کی

بنا پر اگر انہیں ضیا ابن بیطار اور اس الاطبا کہنا بیجا نہیں ہے تو سفر کی کثرت اور ان
سفرناموں کی وجہ سے ان کو حکیم ناصر خسرو اور ابن بطوطہ کہنا بھی نامناسب نہیں ہے
ریگ رواں میں یونان اور جنوبی افریقہ کے اکیس (۲۱) روزہ سفر کی روداد قلمبند کی گئی
اس کے شروع میں یکم تا ۴ اپریل کی جو ڈائری لکھی ہے اس سے حکیم صاحب کی مشغول
متحرک اور سراپا عمل زندگی، صحیح نقطۂ نظر اور بہتر انداز فکر کی مکمل تصویر سامنے آگئی
ہے، اس کے بعد وہ ۵ اپریل کو کراچی سے یونان روانہ ہونے اور اس سفر کے
مشاہدات، اپنے معمولات اور تاثرات بیان کرتے ہیں، اس کے ضمن میں یونان
کی قدیم تاریخ اور اس کے بارے میں گوناگوں مفید معلومات تحریر کی ہیں اور
یونان و ترکی آویزش کا پس منظر بتایا ہے، ترکی کے مسلمان عثمانی فرمانرواؤں،
فتح قسطنطنیہ اور جدید ترکی کے متعلق معلومات اور یونان کے مشہور حکما کے حالات اور
علمی خدمات بھی بیان کی گئی ہیں، پھر مصنف نے جنوبی افریقہ میں جوہانسبرگ، ڈربن،
اور کیپ ٹاؤن نیز پیرس پہنچے اور وہاں کی مصروفیتوں، مشاہدات اور ہر ہر جگہ کے علمی، تعلیمی
تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، مذہبی، اقتصادی، زرعی، جغرافیائی اور تاریخی حالات
لکھے ہیں، اسی حصہ میں جنوبی افریقہ میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت، وہاں کے مسلمانوں
کے مسائل اور نسل پرستی کی تحریک کا جائزہ گہرائی اور دقت نظر سے لیا ہے، آخر میں
جنوبی افریقہ کے بارے میں اسلامی لٹریچر کی فہرست دی گئی ہے اس سے اس
اس موضوع پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی، دوسری کتاب ماوراء
البحار میں روس، امریکا، کینیڈا، برطانیہ اور مغربی جرمنی کے متعدد شہروں
کی سیاحت کا حال بیان کیا گیا ہے، ستائیس (۲۷) روز کا یہ سفر بعض کانفرنسوں اور

کانگرسوں میں شرکت، مدینۃ الحکمت اور ہمدرد یونیورسٹی کے لیے مفید معلومات اور
ضروری تجربات حاصل کرنے کے لیے کیا گیا تھا، اس میں گوناگوں حالات و واقعات
کے علاوہ مختلف اصحاب علم و نظر سے حکیم صاحب نے اپنی ملاقات اور مختلف مسائل پر گفتگو
اور تبادلۂ خیالات کی تفصیل پیش کی ہے جن سے ان کی علم و واقفیت، مشاہدہ
و تجربہ اور ان ملکوں کے بارے میں مختلف النوع معلومات حاصل ہوتے ہیں، دونوں
سفرناموں میں ان ملکوں کے طبعی، جغرافیائی، تاریخی، مذہبی اور تعلیمی حالات، عام لوگوں
کے طرز فکر و طرز زندگی، اہم واقعات، پیداوار اور معدنیات کی تفصیل درج ہے
اور ان سے حکیم صاحب کے روزمرہ کے مشاغل و معمولات، متوازن نظریات،
دردمندانہ خیالات، گوناگوں سرگرمیوں، قومی و بین الاقوامی امور و مسائل سے
واقفیت، پاکستان کے ذہنی و فکری رجحانات اور سیاسی و معاشی حالات سے
باخبری اس کی اور مسلمانوں کی زبوں حالی سے فکر و تشویش اور ان کی مشکلات اور
پریشانیوں کو حل کرنے کے لیے پرخلوص جد و جہد کا اندازہ ہوتا ہے، دونوں سفر
ناموں میں مختلف مناظر اور موقعوں کی پرکشش تصویریں بھی دی گئی ہیں، اپنی مختلف
خوبیوں اور حکیم صاحب کے حسن بیان کی وجہ سے یہ سفرنامے دلچسپ، معلوماتی اور
قابل مطالعہ ہیں۔

اورنگ سلیمان مرتبہ جناب آفاق صدیقی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت
و طباعت بہتر، صفحات ۳۰۴ مع ڈسٹ کور، قیمت درج نہیں پتہ، مجلس علوم
اسلامیہ/۱۸- بہار کالونی، بہادر یار جنگ روڈ (رشید روڈ) کراچی نمبر ۵

مجلس علوم اسلامیہ کراچی نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کے صد سالہ جشن ولادت

کی مناسبت سے مختلف پروگرام منعقد کیے تھے، یہ کتاب اسی سلسلہ کے ایک سیمینار میں موصول خطوط و پیغامات اور اس میں شریک حضرات کے مضامین و نگارشات پر مشتمل ہے، اس کے شروع میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر جاوید اقبال اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ جیسے اکابر کے تاثرات اور پیغام درج ہیں پھر سید صاحبؒ کے حالات و کمالات پر مختلف مشاہیر اہل قلم کی تحریریں اور مضامین دیئے گئے ہیں جن سے ان کے علمی، ادبی اور تحقیقی کارناموں اور مذہبی، ملی و قومی خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔ حالات و سوانح پر بھی بعض مضامین میں بحث و گفتگو کی گئی ہے نثری نگارشات کے ساتھ ہی نظموں کی چاشنی بھی ہے۔ اورنگ سلیمان جن اہل قلم کے نگینوں اور جواہرات سے جڑی ہوئی ہے ان میں اکثر بڑے ممتاز اہل قلم ہیں اور حضرت سید صاحبؒ سے بعض کا عزیزانہ تعلق بھی ہے، مندرجہ ذیل ناموں سے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا۔ جناب سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم ڈاکٹر غلام محمد، ڈاکٹر سید سلمان ندوی، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری، سید شہاب الدین دسنوی اور ابوالخیر کشفی۔ خود مجلس علوم اسلامیہ کے صدر پروفیسر سید فخر الحسن پرنسپل لیاقت گورنمنٹ کالج کراچی کا مضمون بھی قیمتی ہے، اس میں حضرت سید صاحب کے پاکستان میں قیام کے زمانہ کے حالات و واقعات زیر بحث آئے ہیں سید صاحب سے ان کا عزیزانہ تعلق بھی ہے اور گہرا جذباتی لگاؤ بھی، اس مجموعہ کے سب ہی مضامین اچھے اور دلچسپ ہیں اور ان سے سید صاحبؒ کے بارے میں بعض مفید اور نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

"ض"